لہ دعوۃ الحق
قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر دارالعلوم ۔۔۔ ۴
فون نمبر دھالنش ۔۔۔ ۲

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

جلد نمبر : ۷ صفر المظفر ۱۳۹۲ھ
شمارہ نمبر : ۷ اپریل ۱۹۷۲ء

مدیر
سمیع الحق

اس شمارے میں

مغربی ومشرقی پاکستان سے سالانہ ۔/۸ روپیہ فی پرچہ ۷۵ پیسے غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ ہوائی ڈاک دو پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

قومی اسمبلی
سرحدی معاہدہ
تعلیمی پالیسی
ٹیکس بجٹ

اگر خدا نے چاہا اور ملک کو کسی نئے بحران کا سامنا نہ کرنا پڑا تو ۱۴ اپریل کو قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوگا جس پر ملک کے کروڑوں مسلمانوں کی نگاہیں دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ اس موقعہ پہ قومی اسمبلی کے تمام ارکان عموماً اور برسر اقتدار جماعت کی پوزیشن بڑی نازک ہے۔ قدرت نے انہیں ایک عظیم آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ انہیں ملک کو بحران سے نکال کر ترقی و خوشحالی اور پائیدار امن و اطمینان کے خطوط پر ڈالنا ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کی روشنی میں اسے پوری سنجیدگی، حقیقت پسندی اور مفاہمت کے ماحول میں اور خلوص و للہیت کے جذبہ سے بنیادی مسائل پر غور کرنا ہے۔ اسلام سے غداری کا مزہ پورے ملک اور بالواسطہ پورے عالمِ اسلام نے چکھ لیا ہے۔ اگر اس زلزلۃ الساعۃ سے بھی ہمارا خمارِ غفلت نہیں ٹوٹ سکا۔ تو گویا ہم پر ایک ایسی موت طاری ہو چکی ہے جو یومِ مکافات کیلئے صورِ اسرافیل ہی سے ختم ہو سکتی ہے۔ ملک کے بنیادی مسائل معاشی ہوں یا اقتصادی، زرعی اور معاشرتی ہوں یا تعلیمی سب کے اصلاح طلب ہونے پہ پوری قوم متفق ہے۔ اختلاف طریق کار ہے۔ اگر ہم اس اختلاف کو ختم کرنا چاہیں اور ملک کو ایک ایسا آئین دینا چاہیں جو آئندہ بازیچۂ اطفال نہ بنے اور وہ واقعی معنوں میں ہماری تمام مشکلات، نظریاتی اختلافات اور فکری انتشار کا مداوا ثابت ہو سکے، تو یہ ضمانت ہمیں صرف اور صرف مکمل اسلامی قانون ہی دے سکتا ہے۔ ہر چند کہ اسمبلی کے پہلے اجلاس کا کام صرف عبوری آئین کی منظوری دینا ہے۔ مگر چند باتیں ایسی ہیں جن سے بے اعتنائی اور گریز ملک کو آئندہ ہولناک ترین بحران اور فکری انتشار میں ڈال سکتا ہے۔ اس لئے ان پر تمام ارکان اسمبلی کا مکمل اتفاق رائے ہونا چاہیئے۔ ۱۔ آئین کی کوئی دفعہ نہ صرف یہ کہ کتاب و سنت کے مخالف نہیں ہوگی بلکہ مثبت طور پہ یہ ضمانت بھی ضروری ہے کہ ہر دفعہ قرآن و سنت کے مطابق ہو۔ ۲۔ تمام قانون سازی کتاب و سنت کی روشنی میں کی جائے گی۔ ۳۔ اس اسلامی اسٹیٹ کی صدارت اور دیگر کلیدی مناصب (انتظامیہ، عدلیہ، بحری و بری، فضائی افواج) سمیت کسی منصب پر غیر مسلم فائز نہیں ہو سکے گا۔ ۴۔ مسلم کی تعریف وہی ہوگی جو مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے ان مسلّمات دین کو ملحوظ رکھ کر ہر دور کے معتمد علیہ علماء کرتے چلے آئے ہیں۔ ۵۔ بنیادی جمہوری حقوق کی حفاظت۔ ۶۔ عدلیہ کی اسلامی خطوط پر ترتیب، انتظامیہ پر اس کی برتری اور مکمل آزادی۔ ۷۔ مارشل لاء کا دائمی خاتمہ۔

قدرت نے ہمارے معزز ارکان کے کاندھوں پر نہایت ناسازگار حالات میں گرانبار ذمہ داریاں ڈال دی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سے اس اسلامی جمہوریہ اور اس کے عوام کی توقعات کتنی پوری ہو سکیں گی۔ حق تعالیٰ

پردۂ غیب سے صلاح و فلاح کے اسباب ظاہر فرما دے اور اپنی دستگیری سے اس ابتلاء کو خیر و بھلائی اور ہدایت و نزول برکات کا ذریعہ بنا دے۔ وما ذلک علی اللّٰہ العزیز۔

جمعیۃ العلماء اسلام، پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کا باہمی سمجھوتہ ملک کے ہر طبقہ میں سراہا گیا، سقوط مشرقی پاکستان نے حالات اور سیاست کا رخ بدل دیا اور جو لوگ اپنی مخلصانہ صوابدید کی بناء پر اس اتحاد پر چیں بجبیں ہو سکتے تھے، اب اس مفاہمت اور سمجھوتہ کو ملک کی سالمیت اور بقاء کا ذریعہ سمجھ کر اس پر اطمینان کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہمیں نیشنل عوامی پارٹی کے عمائدین کی بہ تکرار ان یقین دہانیوں پر بے حد خوشی ہے۔ جس میں جمعیۃ العلماء اسلام کے ۶ نکاتی پروگرام کا احترام رکھنے کی یقین دہانی کی گئی ہے۔ اس پروگرام کی پہلی شق صوبوں میں اسلام کے ماتحت قانون سازی اور مرکزی مجلس مقننہ میں اسلامی آئین کے بارہ میں جمعیۃ کی حمایت ہے اور مزید مسرّت خان عبدالولی خان صاحب کے ان الفاظ سے ہے جو انہوں نے دستور سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہے اور فرمایا "کہ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نیپ نے اکثریت کے باوجود جمعیۃ کو صوبہ سرحد میں وزیر اعلیٰ مقرر کرنے کا حق اس لئے اختیار دیا ہے کہ ہم اس ملک میں اسلامی معاشرہ چاہتے ہیں۔ (نوائے وقت ۱۷ مارچ) سیکولر ریاست کے بارہ میں نیپ کے سربراہ نے اپنے موقف میں جس خوش آیند تبدیلی کا اعلان کیا ہے، ہم اُسے بھی اکابرین جمعیۃ کی مدبرانہ سیاست اور اس اتحاد و اشتراک کا ثمرۂ خیر سمجھتے ہیں۔ اب جبکہ سرحد میں اس اتحاد کی رو سے جمعیۃ العلماء اسلام کو وزارت سازی کا موقعہ مل رہا ہے، تو ملک کے تمام مخلص دیندار اور دین کے درد مند افراد اور جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے گرد بیجا شکوک و شبہات کا حصار کھینچنے کی بجائے اسے اسلام کے نشاۃ ثانیہ اور مثالی معاشرہ کا پیش خیمہ سمجھ کر اسکی کامیابی کے لئے دست بدعا ہوں۔ کیا عجب یہ سہ جماعتی معاہدہ شمال مغربی سرحدی علاقوں میں دینی اقدار کے فروغ اور فواحش و منکرات کے ازالہ کا ذریعہ بن جائے اور جو سرزمین سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے خون شہادت سے لالہ زار بنی وہ آج سیدین شہیدین کے خوابوں کی تعبیر اور شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی کے سپنوں کی آماجگاہ بن جائے ـــ ھذا تاویل رویای من قبل قد جعلھا ربی حقا۔

صدیوں بعد کسی خطہ میں علماء حق کا برسر اقتدار آنا جتنی مسرّت کی بات ہے، حالات اور زمانہ کے لحاظ سے اتنی ہی نازک ترین آزمائش بھی ہے۔ جہاں اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، تعلیم ہر میدان میں بتدریج تبدیلیاں لانا ہیں۔ اسکی صورت اور طریق کار کیا ہو۔ ؟ اسلامی نظام کے مطابق کونسی باتیں اولین اور کونسی چیزیں ثانوی اہمیت کی حامل ہونگی اور ہمیں دینی اصلاحات کے سلسلہ میں دین سے عمومی گریز کی فضاء میں

بین الملکی حدود میں رہتے ہوئے کس طرح اسلامی نظام حکومت کو اپنانا ہوگا۔؟ یہ اور اس قسم کے بیشمار مسائل جمعیۃ العلماء اسلام کے اکابر اور خاص طور پر اس کے اولوالعزم اور مدبر قائد مولانا مفتی محمود صاحب کے سامنے ہیں۔ اسلامی خلافت راشدہ کی آرزو اگر صرف جمعیۃ کی نہیں بلکہ تمام دردمند مسلمانوں اور جماعتوں کا مرکز تمنا ہے تو آئیے سب بڑھ کر اس حسین تصور کو جامۂ حقیقت پہنانے میں جمعیۃ العلماء اسلام کا ہاتھ بٹائیں اور اپنی تمام تر امداد قوت اور وسائل سے اسکی پشت پناہی کریں۔ اسطرح اللہ کی رحمتیں ہمارے ساتھ ہونگی۔ اس مرحلہ پر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اپنے محبوب قارئین کو بھی اس دعا میں شریک کرادوں۔ معزز قارئین آئیے سب بارگاہ ایزدی میں ہاتھ اٹھا کر خلوص دل سے دعا کریں کہ بار الٰہ مدتوں بعد جب تو نے اپنے بندوں کی ایک جماعت کو ایک مختصر سے خطہ میں اس نعمت سے نوازا کہ وہ وہاں تیرے دین کا بول بالا کر سکیں تو اب انہیں توفیق بھی عطا فرما کہ وہ اس پُر خطر اور سنگلاخ وادی سے سرخرو ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں۔ یہاں کے چپہ چپہ میں منکرات اور برائیوں کی بجائے نیکی اور بھلائی کا دور دورہ ہو۔ اگر تو نے یہ نازک ذمہ داری جمعیۃ العلماء اسلام کے کاندھوں پر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اب ہر طرح ان کی دستگیری بھی فرما اور ان لاکھوں اسلام کے نام لیوا شیدائیوں کی آنکھوں کو ٹھنڈا کر جو صدیوں سے خلافت راشدہ کا نمونہ اور اسلامی معاشرہ دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں صدر محترم نے نہایت اہم تبدیلیوں کا اعلان کیا ہے، ان اصلاحات سے مشکلات اور خرابیوں کا کس حد تک ازالہ ہو سکے گا۔ اور اسکی شرعی یا غیر شرعی حیثیت اور موثر ہونے یا کس حد تک ہونے کے بارہ میں ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی کے بارہ میں اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس پالیسی سے وہ توقعات پوری نہیں ہو سکتیں جو ملک و ملت کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لحاظ سے نظام تعلیم اور تعلیم سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ہر چند کہ صدر محترم کا ارشاد ہے کہ ہم دین اسلام کی روح اور دینی اقدار کو تعلیمی نظام میں سمودینا چاہتے ہیں۔ مگر اس کی روشنی میں جب طویل الذیل تعلیمی پالیسی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہو جاتی ہے نہ صرف بحیثیت مسلم قوم بلکہ حالیہ ذلیل ترین شکست کے بعد ایک شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے ہمیں تعلیمی پالیسی اس بنیاد پر بنانی تھی کہ پورا تعلیمی نظام فرد اور معاشرہ کی اخلاقی اور ایمانی تربیت کا ذریعہ بن جاتا، وہ مایوسی کی بجائے ولولہ، شک اور اضطراب کی بجائے ایمان و یقین خود فراموشی کی بجائے ضبط نفس کا موجب بنتا جو ایک بلند و برتر پاکیزہ اجتماعی مقصد اور اس کے لئے والہانہ جوش اور ولولہ سے سرشار کرکے قومی یکجہتی، اتحاد اور یگانگت کا ذریعہ بن سکتا اور وہ واضح حسین اور شفاف تصور حیات قوم کے منتشر شیرازہ کو ایک لڑی میں پرو دیتا اور جو

اندر سے ایمان و یقین اور اخلاقی اقدار کی جڑیں ابھار کر ہماری تمام اخلاقی و معاشرتی اور طبقاتی نا ہمواریاں کا مداوا بن جاتا اور یہ سب کچھ تب ہوتا کہ ہم ایمان و یقین، خدا و رسول، اسلام اور شریعت کو پوری تعلیم کا محور بنا دیتے۔ طبعیات، حیاتیات اور نفسیات کی کتابوں کو خدا کے تصور کے دائرے میں لے آتے سائنس کو مذہب کا خادم بنا کر پیش کرتے، مادیات کو آخرت کا وسیلہ قرار دیتے، طالب العلمانہ دور کو نہ صرف تعلیم بلکہ ایک مہذب مسلمان شہری کی تربیت کے لئے غنیمت سمجھ لیتے۔ اس طرح ملک کی تعمیر ہو سکتی۔ الحادی اور عیشی و مادی طغیانیوں میں ڈوبتا ہوا معاشرہ ساحل امن سے ہمکنار ہو جاتا۔ تعلیمی پالیسی بامقصد ہونے کی صورت میں اخلاقی تربیت، تہذیب نفس کا ذریعہ بنتی اور پوری قوم کو متحد بنا کر اسے اجتماعی عمل اور جدوجہد پر اکساتی اور صحیح معنوں میں ایک اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا۔

کراچی کے ہاکس بے پر جو شرمناک واقعہ رونما ہوا، اخباری اطلاعات کی بناء پر اس سے صدر مملکت سے لیکر قوم کے عام افراد تک کی آنکھیں شرم سے نیچی ہو گئیں اور واقعی سینکڑوں جوان لڑکوں کا سینکڑوں لڑکیوں پر ٹوٹ پڑنا اور بھوکے کتوں کیطرح انہیں نوچنا اور بھنبھوڑنا ایک دوسرے پر بلہ بولنا، الغرض قوم کی شرم و حیاء کا جنازہ اس شان سے ہاکس بے کے ساحل پر سمندر میں ڈبو دینا۔ خود شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ مگر کیا واقعی ہماری نگاہیں شرم سے نیچی ہو گئی ہیں۔ یا شاید یہ بھی ایک رسمی حیاداری کا مظاہرہ ہے۔ ہم ہاکس بے کی حیا باختہ نوجوان پود کو کوستے ہیں۔ مگر یہ واقعہ تو پوری قوم کی ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ تم انہیں کوستے ہو تو اپنی عقل و خرد کا ماتم کیوں نہیں کرتے، تمہیں صرف ان شریف زادیوں سے ہمدردی کیوں ہے جو مادر پدر آزاد بن کر آوارہ نسلوں کیلئے سامانِ تفریح بننے ہی کیلئے پکنک منانے تفریحی ساحلوں پر جاتی ہیں۔ اگر کوسنا ہے تو دونوں کو کوسو اور اگر ہمدردی کے مستحق ہیں تو لڑکیوں کیساتھ لڑکے بھی کہ ہم ہی ان کے اخلاق اور شرم و حیاء کے قاتل ہیں۔ ہم ہی نے انہیں ہوسناکی اور حیوانیت کے اس ہلاکت آفریں راستہ پر ڈال دیا ہے۔ شرم سے آنکھیں نیچی کرنے والے بزرگو! ذرا آنکھیں اٹھا کر تو دیکھو تمہارے تعلیمی اداروں میں کیا پڑھایا جاتا ہے اور کن کن عملی تجربات کی لیبارٹریوں سے قوم کی نئی پود گذاری جا رہی ہے۔ اور وہ دیکھو فلم کا پردۂ سیمیں وہ تو "قومی ترقی" میں بنیادی کردار ادا کر رہا ہے۔ اور وہ جب ٹی وی پر نوجوان پود پرانی نسل کی داڑھیاں نوچ رہی ہوتی ہے تو تمہارا جذبہ غیرت کہاں مر چکا ہوتا ہے۔ اور تمہاری جبین غیرت ریڈیو پر فحش مبتذل گانے سن سن کر اور سنا سنا کر کبھی عرق آلود نہیں ہوتا۔ پھر جب آگ اور پانی کو یکجا کرنے کا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے تو تمہاری آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ میری نگاہیں تو اس واقعہ سے نہیں بلکہ قائدین اور سرخیل قوم کے اس اعتراف شرم پر شرم کے مارے جھک گئی ہیں کہ ؎

درمیاں قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

سمیع الحق

مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیری

عظیم اسلامی مملکت کی بربادی کی ذمہ دار

شراب

اسلام کی نظر میں

اے صدر محترم ایک نگاہ اس پر بھی ۔ (ایڈیٹر)

شراب اور دماغی امراض شراب سینکڑوں قسم کے دماغی امراض پیدا کرتی ہے اس کا انکار بھی حقائق و واقعات کے انکار کے مترادف ہوگا۔ ے نوش جن دماغی عارضوں میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں، اس کا اظہار اطبا اور حاذق معالج آئے دن کیا کرتے ہیں، اور اس ہلاکت عظیم کو شراب کی دوسری مضرتوں میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ:

خداوند عالم نے شراب میں کوئی شفا نہیں رکھی وہ دماغ کو جو مرکز عقل ہے۔ شدید نقصان پہنچاتی ہے۔ فقہاء اور اطباء سب اسے تسلیم کرتے ہیں۔	ما جعل اللّٰہ لنا فیہا شفاء قط فانہا شدیدۃ المضرۃ بالدماغ الذی ہو مرکز العقل عند الاطباء والفقہاء۔

(زاد المعاد جلد ۳)

سب یونانی کا سب سے بڑا ماہر اور حاذق طبیب جس کے تجربات و حذاقت پر یونانی طب کے علاوہ ڈاکٹری میں بھی بڑا اعتماد ہے اور یورپ کی مخصوص طب، صدیوں کے روشن تجربات کے باوجود بقراط کی فنی مہارت کا انکار نہ کرسکی۔ یہی دنیا کا مایۂ ناز طبیب "بقراط" کہتا ہے کہ:

ضرر الخمر بالرأس شدید	شراب کا سب سے زیادہ ضرر دماغ کو پہنچتا ہے۔
وھو کذالک بالذھن۔	اور ایسا ہی ضرر اس سے ذہن کو پہنچتا ہے۔

صاحب "اکمال" نے بھی لکھا ہے کہ:

انّ خاصۃ الشراب الاضرار بالدماغ والعصب۔

یعنی شراب کی خاصیت ہے کہ وہ دماغ اور پٹھوں کو شدید نقصان پہنچاتی ہے۔ بقراط کی طبی حذاقت

پر اعتماد کے بعد شراب کی مضرت کے سلسلہ میں کوئی وجہ نہیں کہ اس کی رائے پر اعتماد نہ کیا جائے۔ لیکن دورِ حاضر کا ذہن جس طرح یورپ کی تحقیقات پر اعتماد کرنے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس کی ساخت کا تقاضہ ہے کہ اس سلسلہ میں یورپ کے پیش کردہ ان اعداد و شمار کو بھی دیکھ لیا جائے جو افراط مے نوشی کی سوائیوں کی جانب سے شراب کی دماغ پر مرتب ہونے والی مضرتوں کے سلسلہ میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ جلیم میں کثرتِ شراب نوشی کے نتیجہ میں جو ہولناک تباہ کاریاں رونما ہو رہی ہیں ان کو دیکھئے۔ لکھا ہے کہ،

"مجرموں میں فی صدی اسی خودکشی کرتے ہیں۔ ۲۰ فیصد قلعہ میں رہتے ہیں۔ ۷۹ فقر و فاقے میں بسر کرتے ہیں۔ اور ۵۰ فیصد فیصدی مجنون اور پاگل ہیں۔" (احکام العقلیہ ص۲۰۵)

اور دنیا کے سب سے زیادہ مے نوش ملک اور عشرت کدۂ یورپ یعنی فرانس میں اسی زہرِ سیال کی ہلاکت خیزیاں اسی طرح سامنے آئیں۔

"کثرت مے نوشی سے جو دو خاص مرض، ایک مرض دماغی سرسام کا اور دوسرا جگر کی خرابی کا پیدا ہوتے ہیں، اس سے مرنے والوں کی تعداد "فرانس" میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۲ء تک ۹۱۸۰۰ کو پہنچی، اور اسی مدت میں فرانس جو انڈو چائنا میں جنگ کرتا رہا اس جنگ میں اس کے مرنے والوں کی تعداد ۱۹۰۰۰ کی رہی اور یہ شمار تو ان امراض سے براہ راست مرنے والوں کا رہا۔ باقی جو لوگ کثرتِ مے نوشی سے بالواسطہ مرتے ہیں۔ یعنی اس کے اثرات سے بالواسطہ ان کی میزان اگر لگائی جائے تو تعداد اس کی بھی دس گنی پڑے گی۔ (بمبئی کرانیکل ۱۹۵۶ء)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مے نوشی کی کثرت اور جام زہر کے پرکیف ناؤ نوش کے نتیجہ میں مرنے والوں کی تعداد جنگ ایسی ہلاکت انگیز و تباہ کن چیز سے بھی آگے بڑھ گئی۔ اور جنگ بھی چار سو پانچ سو سال قبل کی نہیں، جبکہ تیر و تفنگ اور شمشیر و سنان سے کام لیا جاتا تھا۔ بلکہ ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے زمانہ میں جس سے "ہیروشیما" ایسے آباد و پر رونق آبادی اور حسین شہر کو چند منٹ میں تودۂ خاک بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور ہزارہا بلکہ لاکھوں انسانوں کو دیکھتے ہی دیکھتے خاک و خون میں تڑپنے کے لئے اور خونخوار انسان نما بھیڑیوں کی داستانِ ظلم و عدوان سنانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ فرانس کے اسی عشرت خانہ میں جہاں شرب نوشی کے نے آبادی کا ذرّہ ذرّہ سمٹ کر شراب خانوں میں پہنچ جاتا ہے۔ دماغی امراض اور جگر کی خرابیوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۱۹۵۳ء میں ۳۹۰۵ اور ۱۹۵۴ء میں ۲۱۰۶ تھی۔" (صدق جدید ۲۱ ر اکتوبر ۱۹۵۵ء)

انسداد مے نوشی کے ان اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہوگا کہ شراب سے دماغی امراض اور عارضے کس طرح اور کن مہلک صورتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ دماغی بیماریاں اکثر

جنون | کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ دماغ کے ضعیف اور ماؤف ہو جانے کے بعد جنون کا عارضہ قطعاً متوقع ہے۔ ہندوستان کا مشہور افسانہ نگار اور فحش نویس "منٹو" بار بار جنون میں مبتلا ہو کر پاگل خانوں تک پہنچا۔ اس برگشتہ قسمت افسانہ نویس کی موت پچھلے دنوں جن عبرتناک حالات میں ہوئی وہ خود ایک المناک افسانہ ہے، شراب سے پیدا ہونے والے جنون کے سلسلہ میں یورپ کا ڈاکٹر "بنیٹم" لکھتا ہے کہ:

"افریقہ کے جن لوگوں نے شراب کا استعمال کیا وہ پاگل ہو گئے اور یورپ کے جو باشندے اسکی کثرت رکھتے ہیں وہ بھی جنون کے بیمار ہیں۔ اس لئے شراب کو جلد از جلد افریقیوں کے لئے ممنوع مشروب قرار دیا جائے۔" (طنطاوی ص۱۹۷)

جگر کی بیماری | دماغ کو شدید نقصان پہنچانے کے ساتھ جگر کو بھی اس کی معزتیں تباہ کرتی ہیں۔ حالانکہ جگر بھی اعضائے رئیسہ میں ایک ایسا عضو ہے۔ جس پر جسمانی صحت کا دار و مدار بڑی حد تک ہے۔ خون صالح تیار کرنے کے بعد تمام اعضاء کو ان کی مناسب خواہش کے تحت سپلائی کرنے کا کام قدرتی طور پر یہی عضو رئیس انجام دیتا ہے۔ جن مریضوں کے جگر خون بنانے کا کام چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی صحت جسمانی بالکل معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اطباء و معالجین اس کے علاج و معالجہ میں خاص احتیاط اور غور و پرداخت کی ہدایت کرتے ہیں۔ لیکن آتش سیال اسی کار آمد اور جسم کے فعال عضو کو ماؤف کر دیتی ہے اور صرف ایک ملک میں اسکی ہلاکت خیزیوں کی سالانہ رپورٹ یہ ہے:

"کثرت مے نوشی سے ۱۹۵۳ء میں جگر کی بیماری میں ۱۱۰۰۱ نفوس ہلاک ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں اسی جگر کی بیماری میں مرنے والوں کی تعداد ۱۲۰۰۱ ہوئی۔"

بندش شراب کے ان باخبر اداروں کے ان اعداد و شمار کی روشنی میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مہلک مشروب جگر کو کس طرح نقصان پہنچا کر نہ صرف لب گور بلکہ ہلاک ہی کر کے چھوڑتا ہے۔ ریاست ٹونک کا مشہور "مسلک پرست" شاعر اختر شیرانی جسے اس کے دوستوں نے شراب کی عادت ڈال کر عالم شباب ہی میں تباہ و برباد کیا۔ سوانح نگار نے لکھا ہے کہ:

"شراب نے ان کے جگر کو بھون دیا تھا اور جسمانی صحت کے پرخچے اڑا دئے۔"

(نقوش شخصیات نمبر ص۹۰)

یہاں تک کہ مے نوشی کی کثرت کی وجہ سے یہ نوجوان شاعر لاہور میں ہلاک ہو گیا، شراب نوشی سے پیدا ہونے والے امراض خصوصاً عارضہ جگر کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"لیل و نہار اسی طرح گذر رہے تھے ایک دن آپ پر ردعمل کی کیفیت طاری ہوئی، جس کے نتیجہ میں غشیان و تہوع کی حالت بڑھ گئی، قبض شدید ہو گیا، جگر نے جواب دے دیا اور آنکھوں پر زردیاں چھا گئیں، مجبوراً میں نے انہیں "میو ہسپتال" میں داخل کرایا۔ وہاں پہلے تو کچھ روز ٹھیک رہے، اچانک ایک روز زیادہ طبیعت بگڑ گئی اور بالآخر ۴۳ سال کی عمر میں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو اپنے وقت سے پہلے زندگی کی دشوار گذار راہوں کا سفر ختم کر لیا۔" (ایضاً)

پچھلے دنوں بادہ پرستی کا ہولناک انجام "مجاز" کی موت کی صورت میں سامنے آیا اور "منٹو" کی عبرت انگیز موت کی تفصیلات اخبار بین طبقہ کو معلوم ہیں۔

سکتہ کی بیماری | بادہ نوشی کے نتیجہ میں ایک اور مہلک بیماری "سکتہ" بھی جان لیوا روگ ثابت ہوتا ہے۔ سستی اعصاب، تشنج اور رعشہ کے بعد سکتہ کا خطرناک عارضہ لاحق ہو کر ہلاک کر دیتا ہے۔ طب یونانی کی ایک مشہور کتاب میں ہے کہ :

"شراب ذہن کو بلید کر دیتی ہے، اعصاب کو سست، رعشہ اور تشنج پیدا کرتی ہے اور اکثر شراب پینے والے سکتہ کی بیماری میں ہلاک ہوتے ہیں۔"

تبلد الذھن ویرخی الاعصاب ویورث الرعشہ ویورث التشنج وکثیراً ما یموت السکران بالسکتہ۔

(نفیس ص۲۲۴)

ضعف قلب | صحت انسانی کے قیام و بقا میں جہاں اور اعضائے رئیسہ کو دخل ہے ان میں سب سے زیادہ قلب کی طبعی حرکت کو انسانی زندگی کی بقاء کا دارو مدار بتایا گیا ہے۔ اس عضو رئیس کی حرکت سے انسانی زندگی تعبیر ہے۔ اندرونی نظام کی یہ متحرک گھڑی جہاں بند ہوئی تو انسان کی موت واقع ہوتی ہے۔ اسکی حرکت میں اختلال خطرناک آغاز ہے۔ مصنف نے جسمانی زندگی کے نظام میں قلب کو جو اہمیت ہے اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"صحت جسمانی کا مدار، قلب کی حالت و کیفیت پر ہے اگر قلب اور دموی رگیں صحیح حالت پر نہ ہوں گی تو ان سے متعلق قدرتی عمل پورا نہ ہو سکے گا۔ اور جسمانی صحت کا پورا نظام شکست و ریخت ہو جائے گا۔" (الحیوٰۃ والخمر ص۵)

مصنف نے قلب سے مربوط شریان وعروق کی تفصیل اس کی طبعی رفتار پر مے نوشی کے مہلک اثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

اطباء نے اسی وجہ سے کہا ہے کہ جب شراب جسم میں داخل ہوگی تو قلب کو ضعیف کر دے گی۔ قلب اور اس سے متعلق اعصاب میں شدید عوارض رونما ہوں گی۔	ومن مناشیت للعلماء ان الکحول اذا دخل الجسم ادی الی اضعاف القلب واشرعیه وفیما یتصل بیه من الاعصاب تاثیراً تاماً۔ (ملت ایضا)

اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوگا کہ جب ۲۴ گھنٹے کے عرصہ میں شراب پینے والا ۱۲ اونس (تقریباً ۱ اولس) شراب استعمال کرے گا۔ تو قلب کی حرکت جو ایک گھنٹہ میں ۷۲ مرتبہ ہونی چاہئے تھی طبعی حرکت سے بڑھ جائے گی اور ایک سکنڈ میں ۱۲ مرتبہ حرکت ہوگی۔ یہ حرکت قلب کی معمولاً رفتار سے زیادہ ہے اور مے نوشی کا خطرناک نتیجہ ہے۔ اور پھر کچھ مدت میں غیر طبعی مسلسل حرکت، قلب کو ضعیف کر دے گی۔ جیساکہ مصنف نے لکھا ہے کہ:

مسکرات کے پینے سے قلب سست پڑجائے گا اور عضلات ڈھیلے پڑجائیں گے۔ (الخمر والحیاۃ ملتہ)	وقد ثبت ان ادمان المشروبات الکحولیه یودی شیئاً فشیئاً الی استرخاء القلب وبتره وعضلته۔

چنانچہ اسی ضعف قلب کے نتیجہ میں جو عموماً شراب نوشوں کو عارض ہوتا ہے۔ نوے فیصدی اموات واقع ہو رہی ہیں اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"علاوہ ازیں آجکل حرکت قلب بند ہونے سے اسقدر زیادہ موتیں واقع ہو رہی ہیں کہ کسی اور مرض سے اتنی نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایسی موتیں ۹۰ فیصدی شراب نوشی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ (انسانیت حیوانیت کی راہ پر ص۲۲۶)

گلے کی خرابی حاذق اطباء اور تجربہ کار ڈاکٹروں کا فیصلہ ہے کہ شراب گلے کو بھی سخت نقصان دیتی ہے جسکی وجہ سے نہ صرف آواز بیٹھ جاتی ہے۔ بلکہ گلے میں دائمی خراش، مسلسل کھانسی قائم ہوکر "سل" جیسے موذی مرض کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ لکھا ہے کہ :

"شراب پینے والے کے گلے میں التہاب و تشنج پیدا ہو جاتا ہے جس سے ہوا کی نالیاں بگڑ جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ شرابی عموماً کھانسی کے مریض رہتے ہیں۔ اور

ان کی آواز میں خشونت پیدا ہو جاتی ہے، جب بولتے ہیں تو سخت آواز کے ساتھ اور بسا اوقات پھیپھڑا کی بیماری اور سانس کا مرض "سل" ایسے خوفناک مرض کا باعث ہوتا ہے۔" (الخمر والحیٰوۃ صفحہ ۵۳)

ہندوستان کے ایک مشہور شاعر گلے کی جن شدید بیماریوں میں مبتلا تھے، کیا عجب کہ ان امراض کے پیدا کرنے میں اسی زہر کی سمیات کو دخل ہو۔

فتورِ ہضم | شراب کے فوائد بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ غذا شراب سے خوشگوار ہو کر زود ہضم بن جاتی ہے، اس لئے شراب کا استعمال مفید ہوگا۔ حالانکہ اس شعبہ میں بھی راستے یہی ہے کہ شراب فتورِ ہضم کا باعث بنتی ہے اور قوت ہضم کو سست کر کے اس کے صالح نظام کو درہم برہم کرنے میں اس کو کافی دخل ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ:

"شراب ہضم طعام کے سلسلہ میں بے حد مضر اور مہلک ہے اس لئے کہ یہ معدہ میں پہنچ کر غیر معمولی گرمی اور ہیجان پیدا کرتی ہے۔ یہ تہیج بہت سے امراض پیدا کرتا ہے اور اشتہا کو ساقط کر دیتا ہے، غذا کے کم ہونے پر جسم کو غذا کی اتنی مقدار نہیں پہنچ سکتی جتنی کہ وہ اپنے نظام کو چلانے کے لئے چاہتا تھا، اور غذا کا جو قلیل حصہ پہنچا بھی ہے تو ہضم کے فتور کی وجہ سے بجائے مفید ہونے کے وہ بھی مضر ہوتا ہے۔"

(الخمر والحیٰوۃ صفحہ ۱۷)

شراب میں منافع ثابت کرنے والے برابر کہہ رہے ہیں کہ اس آتش سیال میں غذائی اجزاء بھی ہیں جو تحلیل ہو کر جسم کے لئے بہترین غذا بن سکتے ہیں، شراب میں غذائیت کی تردید کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ:

"شراب میں ایسے اجزا نہیں ہیں جو غذا کا کام دے سکیں، بلکہ یہ تو جسم کی طاقت کو سلب کرنے والی شے ہے، غذا کا کام اس سے نہیں لیا جا سکتا۔" (ایضاً صفحہ ۱۹)

حالانکہ ہضم کا فتور بلکہ اس کا معمولی اختلال و فساد بھی جسمانی صحت کے لئے زبردست مفسدہ ہے، جسمانی صحت کی عمارت ہضم کے صالح نظام پر موقوف ہے، غذا اگر ٹھیک طور پر ہضم نہ ہوگی تو جسم کے تمام اعضاء ضروری اور صالح خون کے حاصل کرنے سے محروم رہیں گے، جس کے نتیجہ میں پوری صحت و تندرستی کا ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اور طاقت و قوت کے نہ ہونے سے آدمی نکما ہو کر نہ صرف اہل و عیال، قبیلہ و خاندان کے لئے بلکہ معاشرہ اور سوسائٹی کے لئے بار ثابت ہوگا۔ ہضم کے پورے نظام کا اختلال درکنار معمولی سا

سو ہضم بھی انسان سے سرور و نشاط کو چھین لیتا ہے، مستقل زندگی اپنے لئے بھی مصیبت اور معاشرہ کے لئے بھی بلائے بے درمان، بہر حال معلوم ہوا کہ شراب سے قوت ہضم بے حد کمزور اور سست پڑ جاتی ہے۔ چہ جائیکہ اس سے استمرار طعام وغیرہ کا کام لیا جائے، بعض شراب نوش "بیئر" میں خاص طور سے غذائیت کے قائل ہیں۔ اگر بیئر میں غذائیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو معمولی غذائیت ان عظیم نقصانات کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔ جو نقصانات شراب نوشی سے پیدا ہونے والے ہیں۔ اور پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ صالح، غیر مضر اور ارزاں غذاؤں کو چھوڑ کر مضر اور گراں قیمت بیئر کو خرید کر پیا جائے، مصنف نے بھی لکھا ہے کہ:

"کس قدر کھلی ہوئی حماقت اور فضول خرچی ہے کہ آدمی بطور غذا کے بیئر کی کثیر مقدار استعمال کرے۔" (ایضاً ص۹۲)

یعنی بیئر کو خرید کر پینے والے سوائے حماقت و سفاہت کے اور کس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔

جسم کی حرارت ختم ہو جاتی ہے

ایک فائدہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شراب نوشی سے جسم میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے جد و جہد کی تحریک اور کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر بادہ پرستوں کا یہ اشتہاری داعی مشروب "فعال" بنانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس دعوے میں کہاں تک سچائی اور واقعیت ہے۔ اس کا انکشاف کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ:

"اکثر پینے والے کہتے ہیں کہ شراب جسم کی حرارت بڑھا کر، برودت کو زائل کر دیتی ہے۔ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور کہنے والے حقیقت سے قطعاً ناآشنا ہیں۔" (ایضاً ص۹)

طب جدید میں یہ بات مسلمہ ہے کہ جسم کے لئے حصول حرارت کا یہ طریقہ صحیح نہیں کہ جسم سے برودت کو زائل کر دیا جائے۔ بلکہ غیر مضر اور مفید شکل یہ ہے کہ جسم میں موجودہ حرارت کو باقی رکھنے کی کوشش کی جائے۔ مزید حرارت پیدا کرنا اور پھر شراب ایسے زہر ہلاہل سے قطعاً غلط ہے، اور پھر اس فریب کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ شراب پینے کے ساتھ ہی جو کچھ عارضی آثار چہرہ وغیرہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ حماقت سے اس کو حرارت سمجھ لیا گیا ہے، جو شخص شراب استعمال کرے گا۔ فوری طور پر اس کا چہرہ سرخ ہو جائے گا۔ اور اس کے رنگ پر سرخی دوڑ جائے گی، کیونکہ شراب کی طبیعت یہ ہے کہ وہ جلد کے اندر عروق شعریہ میں اپنا عمل شروع کرتی ہے۔ کبھی وہ سکڑ جاتے ہیں اور پھر پھیلتے ہیں۔ نتیجہ ان کا یہ ہوتا ہے کہ یہ گیس خون کا وہ حصہ جو کھینچتی تھیں اس تیزی کے ساتھ سکڑنے اور پھیلنے کی وجہ سے خون کو زیادہ کھینچنے لگتی ہیں۔ اس لئے پینے والا خون کے تیز دباؤ کے ظاہری آثار کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ یہ حرارت شراب کی پیدا کی ہوئی

ہے، حالانکہ یہ شعور غلط ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ کیفیت بہت عارضی ہوتی ہے۔ نشہ کے دور ہوتے ہی رنگ اپنی حالت پر آجاتا ہے اور پھر شراب کے استعمال کا رد عمل شروع ہوتا ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہوتا کہ شراب جسم میں حرارت پیدا کرتی ہے تو ان علاقوں میں جو بے حد بارد اور ٹھنڈے ہیں، شراب کی خاص یہ منفعت ظاہر ہونا چاہئے تھی، حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ مثلاً منطقۂ منجمد شمالی اور جنوبی میں شراب کے استعمال کی وجہ سے جسم کی حرارت اور گھٹ جاتی ہے اور اس حرارت کے زائل اور فنا ہونے کی وجہ سے اکثر اموات واقع ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان دونوں منطقوں میں مزدور پیشہ انسان شراب قانوناً نہیں پی سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شراب جسم میں حرارت پیدا نہیں کر سکتی، بلکہ جو کچھ حرارت ہوتی بھی ہے اسے بھی زائل کر دیتی ہے۔

یہاں پر ایک بات اور بھی سمجھ لینا چاہئے، اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شرابی کا چہرہ سرخ اور آنکھیں بھی سرخ ہوتی ہیں۔ ہماری اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ وہ بھی شراب ہی کا اثر ہوتا ہے۔ اور کیونکہ مسلسل استعمال کیا جاتا ہے تو اسکی وجہ سے یہ آثار بھی دیرپا ہو جاتے ہیں۔ ان کو یہ سمجھنا کہ شراب کی پیدا کردہ حرارت ہے قطعاً غلط ہوگا، اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"واذا تعاطى الانسان الكحول زمانا طويلا فان الاوعية الدموية الصغيرة المنتشرة على سطح الجلد بعد ان يتوالى عليها التمدد باستمرار تبقى فى هذه الحالة من التمدد والانبساط ولهذا احمر الوجه والانف وعينيه ملتهبتين"

(الخمر والحیاۃ ص۲۴)

اور جس طرح یہ غلط ہے کہ شراب جسم کو حرارت پہنچاتی ہے، بلاشبہ یہ بھی بداہۃً خلاف واقعہ ہے کہ شراب سے رنگ صاف ہوتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ:

"شراب سے رنگ بھی صاف نہیں ہوتا، بلکہ خون کے دوران کو تیز کرنے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے چہرہ پر سرخی آجاتی ہے اور سکر و نشہ کے زائل ہونے پر وہ سرخی سیاہی سے بدلنے لگتی ہے۔" (ایضاً)

مقالہ نگار کی اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ شراب نہ ہضم طعام کے لئے مفید اور نہ جسم میں حرارت پیدا کرنے کے لئے کار آمد بلکہ اس کے استعمال سے ہزارہا وہ خطرناک اور جانگسل بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جن کی ہلاکت کی تفصیل، اعداد و شمار کی روشنی میں پیش کی گئی ہے، ان اعداد و شمار اور ہماری تفصیلات کے بعد یہ کہنا کہ شراب میں طبی اعتبار سے کچھ منافع ہیں، حقیقت سے کس قدر گریز و انحراف ہوگا۔ اور یہ تو وہ مضرتیں

تھیں، جن کا تعلق جسمانی صحت سے تھا۔ شراب اخلاق پر بھی ایک بہت ناگوار اثر چھوڑتی ہے چنانچہ عموماً شرابی ایسے گندے اور مذموم اخلاق کے حامل ہوتے ہیں جو عام طور پر سوسائٹی میں بڑی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور جن سے تمام ماحول ہمیشہ پریشان اور مکدر رہتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ان اخلاقی بیماریوں کی بھی ایک مختصر سی تفصیل پیش کریں جو مے نوشی کے نتیجہ میں رونما ہوتی ہیں۔

چوری شراب کو حاصل کرنے کے لئے مال و دولت کے تمام ذخیروں کو اس بہتے ہوئے پانی میں صرف کرنے کے بعد شرابی ایسے ذرائع سے بھی چند پیسے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت ناپسندیدہ ہیں۔ چنانچہ عموماً شرابی چور ہو جاتے ہیں، اور بعض اوقات یہ چوری بہت سے جرائم کی پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں کراچی میں "دنیا کے بادشاہ" گرفتار ہوئے، اخبار نے اس خبر کی تفصیل دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> "پولیس نے کل رات صدر سے ایک نوجوان کو جو اپنے آپ کو دنیا کا بادشاہ بتاتا ہے، دوکان کا شیشہ توڑ کر دوائیاں چراتے ہوئے گرفتار کر لیا، بتایا جاتا ہے کہ جب پولیس نے اس نوجوان کو پکڑ کر اس کا نام پوچھا تو اس نے بادشاہوں کی طرح اکڑ کر نہیں اینٹھتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا کہ میرا نام "دنیا کا بادشاہ" ہے۔ پولیس کے سپاہی نے کئی مرتبہ اس سے نام دریافت کیا، لیکن ہر بار اس نے یہی کہا، آخر اسے پولیس تھانے لے جایا گیا، لیکن وہاں بھی پولیس افسر اس کا نام معلوم نہ کر سکے، جوان کی حرکات و سکنات کچھ اس قسم کی تھیں کہ پولیس افسر گھبرا گئے اور اس کا معائنہ کرانے کے لئے ہسپتال بھیج دیا گیا، ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ نوجوان بہت زیادہ شراب پئے ہوئے ہے۔"
>
> "آزاد" ۳ر دسمبر ۱۹۵۹ء لاہور

شاید بعض لوگوں کو شبہ ہو کہ نشہ کی حالت میں ایسی حرکات غیر متوقع نہیں اس لئے ایسے چند واقعات سے شرابیوں پر "چوری" کا الزام کس حد تک صحیح ہوگا، لیکن ہم نے کہا ہے کہ شراب کو حاصل کرنے کے لئے ہر مناسب اور غیر مناسب اقدام کئے جا سکتے ہیں اور چوری سب سے زیادہ قریبی ذریعہ ہے ناجائز طور پر مال و دولت حاصل کرنے کا۔ "الخمر والحیٰوۃ" کے مصنف نے بھی لکھا ہے کہ:

> "وقد دلت الشواهد في كثير من الاحيان على ان خيانة المحمود بدأت عند بعض السارقين حين اعوزهم المال لشراء الخمور التي الفوا تعاطيها ولم يطيقوا صبرا على تجنبها فاصلحت فيهم بذالك عادة السرقة حتى صار التلصص لبعض طباعهم وسجية من سجاياهم". (ص۹۵)

مطلب وہی ہے کہ شراب کے عادی ہو جانے کے بعد ایسے جرائم کا ارتکاب غیر یقینی نہیں، بعض اوقات شرابی ایسی کم قیمت چیزوں کی بھی چوری کرنے سے گریز نہیں کرتے جو فی نفسہٖ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں لیکن اپنے نشہ اور طلب میں سب کچھ کر گزرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شرابیوں کی ایک بڑی تعداد جن سے جیل خانے ہمیشہ بھرے رہتے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر چوریوں کے الزام میں ماخوذ ہوتے ہیں، یا پھر بٹے ذلیل طریقہ سے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کریں گے اور چند کوڑیوں کے لئے اپنی عزت و وقار کا پاس تک باقی نہ رکھا جائے گا۔ اس لئے شراب کے استعمال کے نتیجے میں

گداگری | گداگری اور بھیک کا اختیار کرنا بھی غیر متوقع نہیں، ذیل کا واقعہ ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور شاعر اختر شیرانی جن کا اسم سے پہلے بھی ذکر گزرا انہیں کے متعلق سوانح نگار نے لکھا ہے کہ:

"شراب کے بارے میں وہ اپنے خاص دوستوں کی جیب کو اپنی جیب سمجھتے تھے اور حسن طلب ایسا لطیف اور شاعرانہ ہوتا تھا کہ بغیر فرمائش پوری کئے رہا نہیں جاتا تھا، ایک مرتبہ مرما کا مہینہ تھا۔ اور میں باہر دھوپ میں بیٹھا مطلب کر رہا تھا کہ دو بلا نوش شاعر دوستوں کو ہمراہ لے کر آ گئے۔

ایک صاحب نے فرمایا: ؎ دھوپ میں اپنے مریضوں کو دوا دیتے ہیں

دوسرے صاحب بولے: ؎ اور شاعر کوئی آئے تو پلا دیتے ہیں

اور اختر صاحب نے فرمایا: ؎ اہل دل ایسے مسیحا کو دعا دیتے ہیں

اس کے بعد ان شاعروں کے سامنے فرمائش شروع کی اور بوتل کے پیسے لے کر چلتے ہوئے۔" (نقوش شخصیات نمبر ۲ ص۹۹۳)

اپنے نشہ کو پورا کرنے کے لئے یہ ذلیل گداگری اور بھیکاری بننا اسی ام الخبائث کا نتیجہ ہے، آہ کہ ایک علمی خانوادہ کا فرد حرام مشروب کے لئے سوال کا ہاتھ پھیلا رہا تھا، حالانکہ کہا گیا ہے کہ: "السوال ذل" یعنی سوال ذلت ہے، سڑکوں پر بیٹھنے والے ترقی مند شہروں میں بھٹے کٹے اصرار و الحاح کے ساتھ مانگنے والے بھکاریوں میں ایک بڑی تعداد ان مصنوعی فقیروں کی ہوتی ہے۔ جو مانگ مانگ کر سیدھے شراب کی بھٹیوں پر جاتے ہیں اور سستے کی بوتلیں پی کر انسانیت کو بھی ذلیل کرتے ہیں۔ اور اس طرح گداگری کا وہ دروازہ غیر ضروری طور پر کھولتے ہیں، جس کو مذموم و معیوب قرار دینے میں مذاہب عالم میں سب سے زیادہ اسلام ہی پیش پیش ہے، یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔؟ اور سرمایہ کے جذب افراد اس ذلیل پیشہ کو اختیار کرنے پر کیوں

مجبور ہوتے ہیں، صرف اسی ام الخبائث کی ناجائز طلب کو پورا کرنے کے لئے جس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ گویا کہ ایک حرام فعل کے ارتکاب پر ایک دوسرے معیوب و مذموم حربہ سے مدد لی جاتی ہے۔ سوچنے والے اگر سوچ سکیں تو شراب کی اسلام میں حرمت کی وجہ خاص اس عنوان سے بھی بہت جلد سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن سکر و نشہ میں کھوئی ہوئی بصیرتیں اور عقل و دانش اب کہاں اس قابل کہ ان نقاط پر سوچنے کی زحمت گوارا کرے۔ اسی طرح شرابی کذب بیانی، خیانت، دروغ بیانی اور وعدہ خلافی کے ان امراض میں مبتلا پائے جاتے ہیں جو عالم انسانی اور اخلاقی زندگی میں سخت معیوب کردار ہے۔

کذب بیانی | شراب نوشی کے نتیجہ میں بعض اوقات اپنے جرائم کو چھپانے کے لئے اس ہتھیار سے بھی کام لیا جاتا ہے، جو اسلامی زندگی سے گذر کر عام اخلاقی زندگی میں بھی بہت معیوب ہے۔ چنانچہ شراب کے متوالوں کی یہ قبیح ترین عادت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ عمداً اور بلا ضرورت ہر وقت کذب بیانی، غلط گوئی، خیانت عہد کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سید عبدالمجید عدم صاحب کے سوانح میں ہے کہ:

> "انہیں دنوں عدم صاحب دو تین روز کے لئے اچانک غائب ہو گئے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ آخر چوتھے روز آئے اور کہنے لگے کہ حضور ایک چھوٹا سا مقدمہ بن گیا ہے، میں حیران ہوا کہ آخر معاملہ کیا ہے، کہنے لگے کہ میں اسی لئے تین چار روز سے آیا نہیں، حضور بات یہ ہے کہ میرے پاس اس دن ایک بوتل رم کی اور چھ بوتلیں بیئر کی تھیں "میانیر" سے کوئی تانگہ والا، لاہور آنے کے لئے تیار نہ تھا، سب کہتے تھے کہ کرفیو کا وقت ہونے والا ہے۔ آخر ایک تانگہ والے کو میں نے تیار کر لیا، بوتلیں ساتھ تھیں، راستے ہی میں کرفیو کا وقت ہو گیا، پولیس نے تانگہ والے کا چالان کر دیا، بوتلوں پر قبضہ کر لیا۔ اور مجھے کوتوالی لے گئے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے استفسار پر میں نے بتایا کہ یہ شراب میں اپنے اور اپنے ایک دوست مسٹر ڈامرسری کے لئے لے جا رہا تھا۔ حضور آج تاریخ ہے اور آج آپ کو میرے ساتھ کوتوالی جانا ہوگا تاکہ معاملہ ختم ہو اور شراب واپس ملے ورنہ حضور شراب مفت میں حرام ہو جائے گی۔" (ص ۱۳۹ نقوش)

ایک معزز اور روشناس کو کوتوالی میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہونا پڑا اور کذب بیانی و دروغ گوئی سے گلو خلاصی کے لئے کام لیا گیا یہ صرف ام الخبائث کی کرشمہ کاریاں ہیں۔ (باقی آئندہ)

ایڈیٹر مکتوب

شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہ

لمحۂ فکریہ

کیا جہاد کو منسوخ سمجھنے والے جہاد کر سکتے ہیں۔؟

پاکستان کی بربادی میں قادیانیت کا حصہ

منظم انسداد کی ضرورت ہے

الحق بابت جنوری و فروری ہر دو میں ہوا سقوط مشرقی پاکستان پر مضامین دیکھے مگر بڑا سبب اس سقوط کا بیان سے رہ گیا۔ بانوے یا پچانوے ہزار فوج کا جو ایک لاکھ کے قریب تھی، ہتھیار ڈال دینا تاریخ اسلام میں اس سے پہلے نظر سے نہیں گذرا۔ یہ عذر غلط ہے کہ ناکہ بندی کی وجہ سے اسلحہ اور کمک پہنچا دشوار تھا۔ ایک لاکھ کے قریب فوج کو کمک کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح اسلحہ بھی ہماری فوجوں نے دشمن سے چھین کر حاصل کیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ دشمن کا کثیر تعداد میں اسلحہ چھینا گیا۔ اور اس سے کام لیا گیا — میرے خیال میں بڑا سبب اس شکست کا یہ تھا کہ ہماری فوج میں اور جرنیلوں میں بعض قادیانی تھے۔ اور یحیٰی خان کے بعض مشیر بھی قادیانی تھے۔ ان لوگوں نے مشورہ دیا کہ ہتھیار ڈال دئے جائیں، اور جنگ موقوف کی جائے۔ اس فرقہ کو پاکستان سے ہمدردی نہیں بلکہ بھارت کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہے۔ کیونکہ ان کا مرکز قادیان بھارت میں ہے۔ پھر یہ جماعت مرتد ہے۔ اس کو اسلام اور شوکت اسلام سے کیا واسطہ۔ ! ان کے نزدیک جہاد منسوخ ہے تو یہ جذبۂ جہاد سے عاری ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ علماء اسلام اس تحریک کو منظم طریقہ سے چلائیں کہ اس شکست کا بڑا سبب قادیانی جماعت کا پاکستان کے ہر شعبہ میں یہاں تک کہ فوج میں اور فوج کے بڑے عہدوں میں دخیل ہو جانا ہے صدر کے مشیروں میں بھی بعض قادیانی موجود ہیں اور اب بھی ہیں۔[1] جب پاکستان بنا اور اس کی وزارت خارجہ کا عہدہ ظفر اللہ خان قادیانی کو دیا گیا۔ تو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب نے نواب زادہ لیاقت علی خان کو کہا تھا کہ قادیانیوں کو حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز کرنا ہرگز جائز نہیں اگر آج اس تلخ گھونٹ کو گلے سے اتار لیا گیا تو آئندہ زہر کا پیالہ پینے کو تیار رہنا چاہئے۔ چنانچہ زہر کا ایک پیالہ تو پی لیا گیا کہ مشرقی پاکستان ہاتھ سے نکل گیا۔ اگر اب بھی ان لوگوں کو حکومت میں اور فوج میں داخل کیا گیا تو دوسرا زہر کا پیالہ پینے کو تیار رہنا چاہئے کہ مغربی پاکستان بھی ہاتھ سے نکل جائیگا خدانخواستہ۔ اس نظریہ کو مسلمانوں میں پھیلانے کی ضرورت ہے۔ میں تو ضعف سے معذور ہوں۔ اس کے لئے ہوشیار کام کرنے والوں کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ جناب والا اس پر توجہ فرمائیں گے۔

والسلام۔

ظفر احمد عثمانی عفی عنہ
۱۲ محرم ۱۳۹۲ھ

[1] اور اب تو نظر بد دور ایک یہودی کھیپ وفاقی کلیدی مناصب پر آگئی ہے۔ "حق"

ابلاغ عامہ کے ذرائع
قومی تخریب کا نہیں
تعمیر کا ذریعہ ہونے چاہئیں

★

مولانا کوثر نیازی ایڈیٹر شہاب ـــ بنام ـــ مولانا کوثر نیازی وزیر اطلاعات

محترم دوست مولانا کوثر نیازی وزارتِ اطلاعات حج و اوقاف کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ ملک کی تعمیر نو اور معاشرہ کی تطہیر میں ہماری صحافت، پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جو موثر کردار ادا کر سکتی ہیں بخوبی واضح ہے۔ پھر ناچ گانے والی ثقافت اور فلمی صنعت جس بے دردی سے ہماری اخلاقی قدروں کی بربادی کا ذریعہ بنتی جا رہی ہے مولانا جیسے زیرک اور حساس انسان اس سے بخوبی واقف ہیں۔ اب تک ابلاغِ عامہ کے ذرائع زیادہ تر تعمیر کا نہیں قومی تخریب کا ذریعہ بنے ہیں۔ محترم وزیر اطلاعات صاحب ایڈیٹر شہاب کی حیثیت سے اسلامی تہذیب و ثقافت سے متعلقہ امور پر بارہا قلم اٹھاتے رہے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے ابلاغِ عامہ کے اہم ذرائع ان کی دسترس میں دیکر انہیں آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ہم ان کی خدمت میں ان ہی کی لکھی ہوئی تحریرات پر کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ خدا کرے۔ وہ اس نازک مرحلہ میں سرخروئی سے ہمکنار ہوں۔ اور اس منصب کو معاشرہ کی اسلامی تشکیل و تعمیر کا ذریعہ بنا سکیں۔ (سمیع الحق)

★

۱۔ ہم نے اس سے قبل بھی کراچی کے اخبارات میں اس قسم کے اشتہارات کا نوٹس لیا تھا۔ اور یہ بات عرض کی تھی کہ اسلام میں تہوار، جہاں تفریح اور خوشباشی کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ وہاں ان کو عبادات کا درجہ بھی دے دیا گیا ہے خاص طور پر عید ہمارا سب سے بڑا تہوار ہے۔ اور اس کی بڑائی یہ نہیں ہے کہ ہم کھیل کھیلیں۔ بلکہ یہ رمضان المبارک میں عبادات کی توفیق پانے پر اظہارِ تشکر کا دن ہے۔ اس لئے اس کا آغاز ایک خاص نماز سے ہوتا ہے۔ اس طرح ہماری خوشیاں اور ہماری تفریح دین و اخلاق کی اقتدار کے

تحت ہو جاتی ہیں۔

ان اعلیٰ اقدار کو قائم اور برقرار رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ہم کتنے ہی ماڈرن ہو جائیں۔ یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ ہماری اپنی ایک ثقافت اور تہذیب ہے۔ مغربی تہذیب ہو۔ یا کوئی دوسری تہذیب اس کی غلامی اور اندھا دھند تقلید بہرحال ماڈرن ہونے کے مفہوم میں شامل نہیں ہو سکتی ہمیں ذہنی اور تہذیبی غلامی سے اپنے آپ کو بہرحال محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اور کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم اپنے تہذیبی دائرول میں رہ کر اپنے عمل سے ان تہذیبی دائروں کا احساس دوسروں کو کرائیں یہ آزاد قوموں کا ایک قابل فخر خاصہ ہوتا ہے۔ کہ وہ دوسروں کی نقل نہیں کرتیں۔ بلکہ دوسروں کو اپنی نقل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مسلمانوں کو کم از کم اپنی تہذیب اور اپنے دین پر اتنا فخر ضرور ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اپنے آپ کو غیر تہذیبوں کی غلامی کے سپرد اتنی آسانی سے نہ کر دیں۔ جس کا اظہار ان اشتہاروں میں ہوا ہے۔ (شہاب۔ ۱۰ر فروری ۱۹۷۲ء صٹ)

۲۔ کراچی کے انگریزی اخبارات میں ہوٹلوں میں ناچ رنگ کی محفلوں کے اشتہارات کراچی کی زندگی کا معمول سے۔ کہا جاتا ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اس سب سے بڑے تجارتی مرکز، بین الاقوامی ہوائی مستقر کی آبادی میں کچھ عناصر ایسے بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ جن کے لئے سکر فروشی سے لے کر لذت فروشی تک کا اہتمام اس شہر کو کرنا پڑتا ہے۔ ہم ذاتی طور پر اس سمجھوتے کے قائل نہیں۔ اور اسے اس جرم کے زیرعنوان رکھتے ہیں۔ جسے "دنفاشہ جرم" کہا جاتا ہے۔ ہم سکر فروشی اور لذت فروشی کو کسی بھی عنوان سے کسی شہر میں جائز نہیں سمجھتے اور ہمارا یہ عقیدہ ہے۔ کہ پاکستان کے معاشرے میں اگر اس قسم کی تجارت کو وسعت سے دخیل ہونے کا موقع دیا گیا۔ تو پاکستان کی بنیادیں اس حد تک مضبوط نہیں رہ سکیں گی۔ جس حد تک انہیں مضبوط رہنا چاہیئے ...... اس لئے ہم صرف مذہبی، اعتقادی یا جذباتی نقطۂ نظر ہی سے نہیں۔ بلکہ شعوری اور خالصۃً قومی اور ملکی نقطۂ نظر سے بھی اس قسم کی مکروہات سے حتی المقدور قولاً اور عملاً اجتناب کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کراچی کے اخبارات میں ان مکروہات کی نمائش کے خلاف ہم علانیہ نفرت کا اظہار کرتے اور اس قسم کی "فیشن ایبل" اور "جدید" تفریحوں اور مصروفیات کو پاکستان کی قوم اور اس ملک کی ملت کے لئے زہر ہلاہل سمجھتے ہیں۔ ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ کوئی مصلحت، کوئی ضرورت، کوئی وجہ زہر ہلاہل کو تریاق نہیں بنا سکتی۔ اس زہر کے اثرات وہی ہوں گے جو تاریخ میں مثلاً روم میں ظاہر ہوئے۔ بازنطینی حشمت وجلال پر مترتب ہوئے۔ اور جو اب انگلستان اور امریکہ کے معاشرے میں بھی کچھ ایسے مخفی نہیں ہیں۔ وہاں کی دیکھ سکنے والی نگاہیں ان اثرات کو مستقبل کے لئے مفید نہیں سمجھ

سکتیں۔ اور ان کے خلاف احتجاج کرنے والوں کی ہرگز کوئی کمی نہیں ہے۔

اس صورت حال میں ہمارے اس ذہنی کرب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جو لاہور سے چھپنے والے انگریزی اخبار میں اسی قبیل کے اشتہارات دیکھ کر ہوا۔ ایک نئے ہوٹل کے قیام کے بعد شاید لاہور کے پرانے فیشن ایبل ہوٹلوں نے اپنی تجارت کو متاثر محسوس کیا ہے۔ اور اسے "نئی زندگی" دینے کے لئے "رات دیر تک کھلے" رہنے ۔۔۔۔ سپین اور اطالیہ کی "پریوں" کے ناچ اور دلچسپی کے دیگر خطوط و نکات کی طرف اپنے سرپرستوں کو متوجہ کرنے کے لئے اشتہارات دینے شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں فواحش اور مکروہات کراچی سے لاہور تک وہ سفر پورا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جن کو لاہور نے مدتوں سے روکے رکھا تھا۔ (شہاب ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۲ء صہ)

۳۔ جواب کا دوسرا حصہ اس سے کہیں زیادہ سائنٹیفک اور ماڈرن تھا۔ کہا گیا۔ کہ پاکستان کی سرے سے کوئی ثقافت نہیں، پاکستان مختلف علاقوں کا مجموعہ ہے۔ جو اپنی ذات میں الگ الگ وحدتیں ہیں ہر وحدت کی اپنی ثقافت ہے جو اپنے اپنے لوک گیتوں، لوک ناچوں، اور لوک کہانیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مختلف علاقوں کے یہی ٹکڑے ٹکڑے کتریاں پاکستان کی ثقافت ہیں۔ انہی کو ابھارنا پاکستان کی ثقافت کا اظہار کرنا ہے۔ چنانچہ جب غیر ملکی مندوبین تشریف لاتے تو ان کیساتھ بڑا لطیفہ ہوتا۔ وہ سابق صوبہ سرحد میں جاتے، تو خٹک ناچ دیکھتے سابق پنجاب میں آتے تو بھنگڑا ملاحظہ کرتے۔ سندھ میں جاتے تو کافیاں سنتے، بلوچستان میں تشریف لے جاتے تو ان کی تواضع الغوزے سے کی جاتی اس سے ان کے ذہن کو یہ تاثر دیا جاتا کہ کم از کم مغربی پاکستان ایک وحدت نہیں ہے۔ یہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا گھر ہے۔ جس کو ایک بنانے والا "ون یونٹ" سے آتا ہے۔ یہ ڈرامہ ہوا، رہا ناچ ہوا تو سٹ۔ بہرحال مغربی پاکستان کو ایک بنانے والی طاقت مغربی طاقت ہی ہے۔ ہمارے اپنے پاس کچھ نہیں۔

جواب کا یہ سائنٹیفک حصہ دراصل اسی تصور کی ایک شاخ تھا۔ جو پاکستانی ثقافت کو پانچ ہزار سال کی قدامتوں میں دھکیل کر موہنجو داڑو جیسے قصبات میں محدود کرنا چاہتا تھا۔ اس تصور میں ترمیم صرف اتنی ہوتی تھی، یہ قصبے پھیل کر صوبے بن گئے، گویا صدیوں کے اثرات کو کسی حد تک قبول تو کر لیا گیا۔ لیکن بہرحال علاقائی وحدت کا جواز باقی رہا۔ واضح رہے کہ یہ سیاسی بات نہ تھی۔ خالص ثقافتی بات تھی۔ اور کیونکہ سیاست، ثقافت سے علیحدہ نہیں رکھی جا سکتی اس لئے اگر اس کے بین السطور وہ تھوڑی بہت

سیاست میں ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ (شہاب ۲۰ فروری ۱۹۶۷ء صث)

۴۔ صدر مملکت پاکستان پورے عالم اسلام کے شکریے کے مستحق ہیں، کہ انہوں نے اہم مسئلہ کی طرف قوم کو متوجہ کیا اور پاکستان پورے عالم اسلام کے شکریے کا مستحق ہوگا۔ اگر اس کے ادیب ایسا ادب پیدا کرنے لگیں جو قوم کے اذہان کو رومان پسندی سے نکال کر حقیقت پسندی اور حقیقت بینی کی منزلوں پر لے آئے۔ (شہاب ۱۰ اپریل ۱۹۶۷ء ص۳)

۵۔ صوبائی وزیر قانون و پارلیمانی امور مسٹر اے بی اخوندزادہ نے کراچی میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے یہ اطمینان بخش اعلان کیا ہے، کہ صوبائی حکومت تعلیمی اداروں میں ناچ گانے کی محفلوں پر پابندی کے حکم کو واپس نہیں لے گی۔ یہ پابندی بدستور جاری رہے گی

گذشتہ سال جب صوبائی حکومت نے تعلیمی اداروں میں ناچ گانے کی محفلوں پر پابندی عائد کرکے ایک عوامی مطالبے کو پذیرائی بخشی تھی۔ تو صوبے کی غالب اکثریت کیطرف سے حکومت کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ ارباب نشاط اور ان کے حامیوں کی ایک خورد بینی اقلیت نے اس فیصلے کے خلاف ناک بھوں چڑھائی۔ اور ان حلقوں نے اپنے طور پر اس کے خلاف احتجاج بھی کیا لیکن یہ واقعہ اپنی جگہ پر کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ کہ حکومت کے حلقوں میں اسی اظہار ناراضگی کو مغربی پاکستان کی رائے عامہ نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے یہ قابل اعتناء قرار نہیں پایا۔ گذشتہ دنوں یہ خبر سننے میں آئی کہ مرکزی حکومت نے اس حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور سکول اور کالج ایک دفعہ پھر ان بیہودہ دھما چوکڑیوں کے مراکز قرار پائیں گے جن کو کسی بھی شریف حلقے میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس نئی کروٹ کے خلاف عوامی حلقوں میں شدید ردعمل ہوا۔ اور اس کی تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ بات نہایت درجہ اطمینان بخش ہے۔ کہ صوبائی حکومت نے اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دی ہے، ہمیں یقین ہے کہ اس کو "سیاسی مسئلہ" بنانے والے حلقوں کیطرف سے بھی اس اعلان کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ (شہاب، ۲۹ جنوری ۱۹۶۷ء صث)

۶۔ اس لئے ہم ان تمام "دانشورانہ" خیالات کو مضحکہ خیز ہونے کی حد تک مہمل سمجھتے ہیں۔ اور ہم نے اس سے پہلے ایک سے زائد مرتبہ اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہمارے یہاں اکا دکا دانشور ایسے بھی سامنے آنے لگے ہیں جو مغرب زندگی کی ان حدود تک نہیں پہنچے کہ اپنی ہر چیز میں انہیں جہالت اور بربریت کی بو آنے لگی ہو۔ ہم سب سے زیادہ اپنے عظیم اور بلند مرتبہ دانشور مسٹر جسٹس ایس۔ اے کار نیلیس کے شکر گذار ہیں جنہوں نے مسلمان دانشوروں سے پہلے عالمی سطح پر اس بات کا اعلان کیا کہ اسلامی قوانین تعزیر صرف قابل عمل ہی نہیں، بہتر نتائج کے حامل بھی ہو سکتے ہیں اور ان کو اختیار کرکے جرائم کی تیخ کنی ممکن ہے۔ (شہاب ۱۲ فروری ۱۹۶۷ء ص۳)

آئین ساز قومی اسمبلی کی توجہ کے لئے

مولانا محمد اشرف صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور

پاکستان کی تعمیرِ نو میں اسلام کی اہمیّت

یہ مقالہ پاکستان اکیڈمی برائے دیہی ترقی پشاور کے علماء پراجیکٹ کے منعقد کردہ علماء کنونشن (۲۹ فروری ۱۹۷۲ء) میں پڑھا گیا

۱۴ اپریل ۷۲ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہے اس سرزمین بے آئین کے باشندوں کی نظریں اس پہ لگی ہوئی ہیں۔ قومی و ملی بقاء و حیات کی کتنی امیدیں اس سے وابستہ ہیں ــــ؟ اس سے ارکان اسمبلی بخوبی آگاہ ہوں گے۔ ہم معزز ارکان کے حق میں نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے پیش نظر مضمون میں نئی آئین سازی کے موقع پہ انکی توجہات ایک نہایت اہم مسئلہ کیطرف مبذول کرانا چاہتے ہیں ـــ تشکیل پاکستان کے وقت اسلامیان ہند سے جو وعدے کئے گئے تھے، ہم آئین سازی کے موقع پر معزز ارکان کو اس مضمون میں اسکی کچھ جھلکیاں بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ (سمیع الحق)

★

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جسکی بنیاد اسلام کے اس جامع اور عالمگیر نظریہ پر رکھی گئی ہے۔ کہ دین اسلام ہی انسانوں کے دینی و دنیاوی تمام مسائل کا حل اور ضرورتوں کا کفیل ہے۔ بانیان پاکستان قائد اعظم مرحوم، لیاقت علی خان مرحوم اور دیگر زعماء لیگ پاکستان کی جدوجہد میں اسی نظریہ کو لے کر آگے بڑھے

سکتے اور اس کی بنیاد پر اسلامیان ہند و پاک نے اپنی امنگیں اور امیدیں اس خطۂ زمین کے ساتھ وابستہ کر دی تھیں جس کا نام پاکستان تھا۔ اور جس میں بقول لیاقت علی خان مرحوم اسلامی نظریۂ حیات کو عملی طور پر رائج کرنا اور اسے اسلامی نظام حیات کا تجربہ گاہ بنانا تھا۔ قائد اعظمؒ نے اپنے کئی بیانوں میں اس بات کو واضح فرمایا تھا، کہ قرآن ہی مسلمانوں کا واحد ضابطۂ حیات ہے، جس میں انکی آئینی، قانونی، مجلسی، معاشی، معاشرتی، غرض زندگی کے ہر ایک پہلو کا جواب حل موجود ہے۔ یاد دہانی کے طور پر چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

قائد اعظمؒ نے نومبر ۱۹۳۹ء عید الفطر کے موقع پر بمبئی سے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں کو لازم ہے، کہ قرآن پاک کو غور سے پڑھیں اور قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کر سکتی۔"

گاندھی کو اگست ۴۴ء میں لکھتے ہیں:

"قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں مذہبی اور مجلسی و دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی، غرضیکہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لیکر روزانہ امورِ حیات تک، روح کی نجات سے لیکر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لیکر فرد کے حقوق و فرائض تک، اخلاق سے لیکر انسدادِ جرائم تک، زندگی میں جزا اور سزا سے لیکر عقبیٰ کی جزا و سزا تک ہر ایک فعل، قول اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔ لہذا جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہے تو حیات و مابعد حیات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں۔"

ستمبر ۱۹۴۵ء کے پیغام عید میں فرمایا:

"ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادت اور اخلاقیات تک ہی محدود نہیں بلکہ قرآن کریم سب مسلمانوں کا دین و ایمان اور قانونِ حیات ہے۔ یعنی مذہبی اور معاشرتی، تمدنی، تجارتی، عسکری، عدالتی اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔"

۱۹۴۲ء میں علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران فرمایا:

"رہنمائی کے لئے ہمارے پاس اسلام کی عظیم الشان شریعت موجود ہے۔۔۔۔۔ اسلام ہر شخص سے یہ امید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض بجا لائے۔"

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر ۴۳ء کی صدارتی تقریر میں واضح الفاظ میں اعلان فرمایا:

"مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرز حکومت کیا ہوگا۔ پاکستان کا طرز حکومت تعین کرنے والا میں کون! یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے۔ اور میرے خیال میں مسلمانوں کا طرز حکومت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا ہے۔"

تقسیم سے پیشتر لیاقت علی خان مرحوم نے جلسہ تقسیم اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ہمارے سامنے ایک نہایت اہم سوال درپیش ہے اور وہ یہ کہ ہم کس نظام کے تحت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنی آئندہ زندگی اسلامی طور و طریق اور آئین و قوانین کے بموجب بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہم کو ایک آزاد اور خود مختار سلطنت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نظام زندگی کیا ہے۔ اور کن اصولوں پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جائے گی۔ اس سوال کا جواب مسلمان کے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے۔ کہ مسلمان کے پیش نظر اس مقصد حیات کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تیرہ سو برس قبل دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغام الٰہی لیکر تشریف لائے تھے۔ اب وہ ہمارے پاس ہے۔ اور وہ دنیا کی عظیم المرتبت کتاب قرآن شریف میں اب بھی بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے موجود ہے۔ ہر مسلمان کا دین و ایمان ہے کہ اس کی موت و حیات سب اللہ ہی کے لئے وقف ہے۔ اللہ ہی ہمارا بادشاہ ہے۔ اور وہ ہی ہمارا حکمران ہے۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ جو کوئی بھی حکومت کرتا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے حکومت کرتا ہے۔ کیونکہ تمام حاکمیت اور طاقت اللہ ہی کو زیبا ہے۔ اسلامی نظام زندگی انسان کا ساختہ پرداختہ نہیں ہے۔ بلکہ واقعی طور پر وہ اس دنیا میں عمل پذیر رہ چکا ہے۔ اور اب بھی ہمارے پاس موجود ہے۔"

ان زعماء ملت کے یہ واضح اعلانات حقیقتاً اس سچائی پر مبنی تھے کہ امت محمدیہ مرحومہ کا اپنا ایک خاص مزاج ہے۔ اور یہ لافانی اور بے مثال امت اپنے قوام و تشکیل ہی میں صرف اس اندرونی یقین و اعتقاد و جذبۂ روح کی محتاج ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ امت محمدیہ کا مزاج سراسر دین پر قائم ہے۔ اگر اس کے دینی مزاج کی رعایت نہیں کی جائے گی تو یہ ملت من حیث الامت ختم ہو جائے گی۔ دوسری قومیں رنگ و نسل و وطن و زبان کی بنیادوں پر تشکیل پاتی ہیں۔ لیکن اسلام ان میں سے کسی بنیاد کو اصل قرار نہیں دیتا۔ وہ ان سب کی تخریب کے لیے

اس مابعد الطبیعاتی جذبۂ ملی پر "امت" کی تشکیل کرتا ہے، جسے "دین" کہتے ہیں۔ اسلام وہ قوی رشتہ ہے جو مختلف قوموں، رنگوں اور نسلوں کے ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ صہیب رومی ہوں یا بلال حبشی، سلمان فارسی ہوں یا ابوبکر قرشی سب ایک ہی ملت واحدہ کے محترم افراد ہیں۔ ان کی "اسلامیت" نے رنگ و نسل کے تمام بندھنوں کو توڑ دیا۔ پولیٹکل سائنٹسٹ موسیو ریناں فرانسادی نے کہا ہے:

"کہ قومیت وہ جذبۂ اشتراک ہے جو مختلف افراد کو ایک لڑی میں پرو کر انہیں مقاصد حیات کی یکجہتی عطا کرتا ہے"

اسلام مسلمانوں میں عشق الٰہی و محبت رسول کا والہانہ جذبہ پیدا کر کے اس داعیۂ اشتراک کو جنم دیتا ہے، جو عقائد و مقاصد کی یکجہتی میں مختلف ملکوں اور مختلف نسلوں اور مختلف رنگوں مختلف طبقات کے انسانوں کو اکٹھا کر دیتا ہے۔ یہ رشتہ روحانی نسلی رشتہ سے برتر و قوی ہے۔ چنانچہ مفسرین امام رازی و امام بغوی وغیرہ نے شواہد سے اس حقیقت کو واضح و مبرھن کیا ہے۔ بقول جامیؒ ؎

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی   کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اسلامی جذبۂ ملی کے ایک سرشار سلمان فارسی نے "اسلامی قومیت" کی بنیاد کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

ابی الاسلام لا اب لی سواہ   اذا افتخروا بقیس و تمیم

"میرے باپ کا نام اسلام ہے، اسلام کے سوا میرا کوئی باپ نہیں، لوگ قیس و تمیم کے قبیلوں پر فخر کرتے ہیں، اور میں "مسلم" ہونے پر فخر کرتا ہوں"

اسلام ملت مسلمہ کا اجتماعی نفس ناطقہ ہے۔ اگر اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ ملت کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہوگا، تو یہ امت پھلتی پھولتی رہے گی۔ اور جس قدر یہ جذبہ کم ہوتا چلا جائے گا اس پر اضمحلال و زوال کے آثار طاری ہوتے جائیں گے۔ حکیم شاعر اکبر الٰہ آبادی نے خوب کہا ہے ؎

جب سر زمین ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصر عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

غرض امت محمدیہ اپنے تمام و مزاج میں جملہ امم و ملل انسانیہ سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ دین و مذہب کے بغیر اس کا ملی تشخص قطعاً ختم ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ نے سچ کہا ہے ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر   خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار   قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں   اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

بہرحال اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد مذہب یعنی اسلام کی اہمیت، پاکستان کی تعمیر نو میں ظاہر و باہر ہو جاتی ہے۔ ہر وہ نظام زندگی یا طریقۂ کار جو اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق نہیں ہوگا پاکستانی ملت کو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکے گا۔ اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔

۱۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اور اس کا وجود اسلامی نظریۂ حیات کا مرہون منت ہے۔ جسے تحریک پاکستان کا ہر واقف کار جانتا ہے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کوئی نظریاتی مملکت اپنے بنیادی نظریہ کو نظر انداز کر کے اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتی۔ جیسے کوئی سوشلسٹ مملکت سوشلزم کے نظریہ کو پس پشت ڈال کر اپنی نظریاتی حقیقت کو گم کر دیتی ہے۔ اسی طرح مملکت پاکستان اگر اپنے آپ کو اسلامی نظریۂ حیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر پاتی، تو وہ نہ صرف اپنے نظریاتی وجود کو کھو دے گی، بلکہ اس کا اپنا وجود و تشخص اور "نام" بھی (خاکم بدہن) مٹ کر رہ جائے گا۔ وہ ممالک اور قومیں جو وطنیت رنگ اور نسل پر قائم ہیں۔ وہ اگر کسی نظریۂ کو قبول یا ترک کر دیں تو ان کی وطنی، لونی اور نسلی انفرادیت باقی رہ سکتی ہے۔ لیکن اگر پاکستان اسلامی نظریۂ حیات سے دست کش ہو جائے تو اس کے ہاتھ سے وہ رشتہ ہی نکل جائے گا۔ جس نے باشندگان پاکستان کو "پاکستانی" بنایا ہے۔ اور بنگالی، بلوچی، پٹھان، سندھی، پنجابی اور مہاجر کو ایک امت کا فرد بنایا ہے۔ غرض پاکستانی قومیت و وطنیت بلکہ اس کا نام تک اسلامی نظریۂ حیات سے باقی و قائم ہے۔ اس لئے پاکستان کی تعمیر نو کا تصور بھی مذہب کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ ہر وہ قدم جو پاکستان میں اسلام کے خلاف اٹھے گا۔ ملک کو مشکلات سے دو چار کر دے گا۔

۲۔ ہر قوم کا خاص مزاج ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد وہ بنیادی عقائد و نظریات، رسوم و رواج ہوتے ہیں۔ جس میں وہ قوم دوسروں سے ممتاز ہوتی۔ امت محمدیہ اپنے مزاج کے لحاظ سے بہرحال "مذہبی" واقع ہوئی ہے، جو اسلام کے خلاف کسی چیز کو گوارا نہیں کر سکتی۔ اور اس کا اجتماعی مزاج کسی ایسی چیز کو ہضم نہیں کر سکتا جو اسلام کے مخالف ہو

ملت پاکستانیہ کا لاشعور ذہنی طور پر کبھی ایسی بات کو قبول نہیں کر سکتا جو مذہب کے خلاف ہو۔ اس وجہ سے قوم کے مذہبی مزاج کو نظر انداز کر کے کوئی قدم ملت کو تعمیر کی راہ پر نہیں ڈال سکتا۔

——— ان دو اہم بنیادوں کے بیان کے بعد چند حقائق کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

حضرات! اسلام نرا نظریہ ہی نہیں، بلکہ بقول قائد اعظم "ایک مکمل اور عملی ضابطۂ حیات ہے۔"

دوسرے مذاہب عملی زندگی میں اگر شکست کھا سکتے ہیں، لیکن اسلام کا آئین و قانون۔ نظام حیات و دستور مملکت چودہ سو سال تک عمل کسوٹی پر کسا جا چکا ہے۔ اس میں ہر زمانہ کے چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسلام کا خدائی و عادلانہ نظام حیات دکھی انسانیت کے لئے واحد پیام نجات ہے۔ پاکستان کے مسائل کا حل بھی صرف اسلام ہے جس کے بغیر ہمارا ہر مسئلہ مزید الجھتا جائے گا۔ آج پاکستان کی وحدت کا راز " مختلف لسانی و علاقائی وحدتوں کو ایک ملت " کی حیثیت سے معنون کرنے میں ہے۔ یہ بات واشگاف لفظوں میں کہی جا سکتی ہے کہ تعمیر نو میں اگر اسلام کے " جذبۂ ملی " کو زندہ و باقی رکھنے کی کوشش نہ کی گئی اور " مذہبی وحدت و جمعیت " کی آبیاری نہ کی گئی تو خدانخواستہ اس پھول کی مختلف پتیاں بکھر کر رہ جائیں گی، جس کا سب سے بڑا ثبوت سقوط مشرقی پاکستان کا دردناک سانحہ ہے۔
اگر ہم نے اپنے دینی مزاج اور مذہبی یکجہتی کو پروان چڑھایا ہوتا۔ تو آج یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ پاکستان کے مختلف خطوں اور لسانی و ثقافتی وحدتوں کے جوڑنے کا واحد ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس نمایاں حقیقت کے بعد تعمیر نو میں مذہب کی اہمیت بلکہ سبقت و فوقیت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں معاشی ناہمواریوں نے معاشرہ میں زلزلہ آگیا ہے۔ اور معاشی بے چینی اور طبقاتی منافرت کا ایسا طوفان برپا ہے جس سے ملک کی چولیں تک ہل گئی ہیں۔ ہمیں یہ بات برملا کہنے میں کوئی باک نہیں، کہ پاکستانی بلکہ انسانی معاشی مسائل کا حل صرف اسلام کی لافانی تعلیمات میں ہے۔ اسلام کا نظام معاش سرمایہ داری کی قارونیت اور مزدکیت واشتراکیت و اشتمالیت کی طبقاتی چپقلش کو بیک وقت ختم کر دیتا ہے۔ اسلام نے معاشی ناہمواریوں کا علاج جس عدل و نصفت سے کیا ہے۔ انسانی خود ساختہ نظام اس کا پرکاہ بھی نہیں کر سکتے۔ اسلام ایک طرف نجی ملکیت اور انفرادی عمل پیدائش کی حوصلہ افزائی کرتا ہے دوسری طرف تقسیم دولت کی ان راہوں کو وجود بخشتا ہے۔ جن سے دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہیں رہتی بلکہ ہر شخص کی ضروریات اربعہ (مکان، خوراک، پوشاک اور تعلیم) کی کفالت کے ساتھ باہمی ہمدردی اور مواسات بھوک و افلاس کو معاشرہ سے ختم کر دیتی ہے۔ تفصیل کا یہ مقام نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ ناجائز پیداوار دولت کے ذرائع سود قمار احتکار حرام آمدنیوں، جن کی کوکھ سے منحوس سرمایہ داری نے جنم لیا ہے۔ اسلام نے کس طرح حرام قرار دیا ہے اور آمدنی کے وہ ذرائع جو دولت کو چند افراد کے ہاتھ میں پہنچا دیتے ہیں، انہیں کیسے ختم کیا ہے، جو دولت کسی کے پاس جمع ہے اسے معاشرہ میں منتقل کرنے کے لئے زکوٰۃ و عشر، خمس و

صدقات ۔ میراث کے لازمی احکام صادر فرمائے ۔ مزید برآں خیرات صلہ رحمی، غریبوں کی غمگساری و مدد وغیرہ کی مستقل خیراتی مدین قائم کیں۔ امیروں کے مال میں ناداروں کا "حصہ و حق" شرعی حدود کے اندر مقرر کیا۔

ناداروں کے مفاد کو مالداروں کا دین قرار دیا اور مالداروں کے حقوق کا پورا کرنا ناداروں کی دینی ذمہ داری قرار دی گئی۔ اسلامی معاشی نظریہ کی جان ہر طبقہ کی ضروریات کی کفالت کے ساتھ باہمی ہمدردی و مواسات۔ مواخاۃ و محبت ہے۔ اسلامی معاشی نظریہ انسانوں میں طبقاتی تفریق و منافرت نہیں پیدا کرتا، بلکہ ہر طبقہ کو اپنے دائرہ عمل میں افزائش دولت کے اسباب مہیا کرنے کے ساتھ ایسی باہمی ہم آہنگی اور جوڑ پیدا کرتا ہے، جہاں حسد و رقابت کی بجائے محبت و تعاون کی فضا قائم ہوتی ہے۔ اسلام میں گو مساوات مالی نہیں، لیکن مساوات رتبی اور مساوات قانونی موجود ہے۔ مجلس رتبہ میں مال و جائداد کی اضافی قدروں کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اخلاق و اعمال کی بلندی۔ "سرفرازی" کا واحد معیار ہے۔ اسلام میں ملک و مال۔ جائداد و جاہ معیار فضیلت نہیں۔ بلکہ علم و تقویٰ اور اخلاق و اعمال ہیں ایک غیور و دیندار صاحب صلاح و تقویٰ مزدور ایک کروڑپتی بد اعمال سیٹھ سے اسلام کی نگاہ میں اونچا ہے۔ اسی طرح قانون کی نگاہ میں آقا و غلام شاہ و گدا سب برابر ہیں۔

اسلام کا معاشی نظام اگر دیانتداری سے نافذ کر دیا جائے تو ایک ایسا ہموار معاشرہ پیدا ہو جائے گا۔ جہاں تمام طبقات باہمی محبت و سلوک حقوق کی ادائیگی۔ خدمت اور مؤانست کی زندگی گذار سکیں گے۔ جہاں آقا و غلام کی تمیز نہیں ہوگی۔ اور جہاں ہر شخص خوشحالی فارغ البالی اور فراوانی کی زندگی گزار رہا ہوگا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام کی وسیع سلطنت میں کوئی زکوٰۃ قبول کرنے کے لائق محتاج نہیں رہا تھا۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی سلطنت جو موجود مغربی پاکستان کی مشرقی سرحدوں سے لے کر اطلانٹک تک اور دیوار چین سے لے کر وسط افریقہ اور اندلس تک پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی نادار ایسا نہ ملتا تھا جسے زکوٰۃ و خیرات دی جا سکے۔ یہ اسلامی معاشی نظام کی برکت تھی کہ جب تک مسلمانوں میں اسلامی اقدار کا پاس رہا۔ طبقاتی منافرت اور مالی حرص و آز کا جہنم وجود میں نہ آ سکا۔ اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے معاشی مسائل کا حل نہ سرمایہ داری میں ہے نہ اشتراکیت میں۔ بلکہ ہم معاشی تعمیر نو صرف مذہب کے بتائے ہوئے خالص الہٰی اصولوں اور احکام کے مطابق کر سکتے ہیں ورنہ ہر قدم مزید الجھنوں کا سبب بنتا جائے گا۔ اس سلسلے میں ہمیں بابائے ملت۔ قائد اعظم کے وہ الفاظ یاد رکھنے چاہئیں جو انہوں نے سٹیٹ بنک آف پاکستان کی بنیاد رکھتے

ہوئے یکم جولائی ۱۹۴۸ء میں اپنی آخری پبلک تقریر میں فرماتے ہیں:

"مغرب کے اقتصادی اصول ہمارے لئے عبرت آموز ہیں، جس کی وجہ سے آج دنیا بحران کا شکار ہے۔ آپ کے تحقیقی ادارے کو چاہئے کہ وہ اسلامی نظریات پر سماجی اور اقتصادی زندگی کی بنیاد رکھے۔ ایک خوشحال اور مطمئن معاشرے کے لئے مغربی اصول کسی طرح مفید نہیں ہو سکتے۔ ہمیں تو ایک نئے طریق کار کو اپنانا چاہئے، جو انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔"

ملک میں جرائم کا جو رجحان اور لاقانونیت کا جو میلان پیدا ہو رہا ہے۔ اس کا علاج مذہبی قوانین اور اسلامی شریعت کا نفاذ و اجراء ہے۔ اسلامی قانون و شریعت کے منافع اور اسلامی نظریہ عدل پر اس مختصر وقت میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں، تاہم یہ بات بے محابا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ انسانی خودساختہ قوانین کبھی عادلانہ نہیں ہو سکتے۔ نہ انصاف کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کر سکتے ہیں کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہر شخص اور ہر انسانی جمعیت وطبقہ کے مخصوص رجحانات، میلانات، تقاضے و مفادات ہوتے ہیں۔ جن سے وہ انسان ہونے کی حیثیت سے کلیۃً کبھی مبرا نہیں ہو سکتا۔ قانون ساز اداروں اور مجالس مقننہ کی روزانہ کی کارروائیاں انسان کی اس بارے میں کوتاہ دستی پر شاہد عدل ہیں، ایک ملک کی قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ ایک قانون بناتی ہے، وہ طبقہ جس کا وہاں غلبہ اور اکثریت ہوتی ہے۔ قانون سازی میں اپنے مفادات پر نگاہ رکھتا ہے۔ اگر انصاف ان کی راہ میں حائل ہوتا ہے تو تاویلات کے پردوں میں اسے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آمریت اور فاشزم میں شخص واحد کی انانیت، قانون قومی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اگر کوئی سرمایہ دار کی بے جا حفاظت کرتا ہے۔ تو کمیونسٹ "مزدور کسان" کی حدود سے بڑھ کر رعایت کرتے ہیں، قانون تو وہی عادلانہ ہوگا جس میں کسی کی رعایت نہ ہو۔ ملکی رجحان نہ ہو۔ نسلی میلان نہ ہو لونی پاس نہ ہو۔ علاقائی لحاظ نہ ہو۔ وطنی مفاد نہ ہو۔ طبقاتی عصبیت نہ ہو۔ غیر سے مخاصمت نہ ہو۔ اپنے کی حمایت نہ ہو۔ کینہ پروری نہ ہو۔ دوست نوازی نہ ہو۔ "مفادات خاصہ" کی ناجائز نگرانی نہ ہو۔ قانون سازی میں مال وجاہ کی طلب نہ ہو۔ مدح و ذم کی پرواہ نہ ہو۔

غرض تمام مفادات سے بالا ہو کر اور ہر "رجحان" سے "تہی خاطر" و خالی دماغ ہو کر محض عدل و انصاف کی بقا کے لئے قانون بنانے یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ یہ تو اس ذات کا کام ہے۔ جو سب تعلقات سے بری، نہ کسی کا بیٹا نہ کسی کا باپ نہ کسی کا رشتہ دار ہو۔ ہر انفعال سے پاک ہو خوف و رعایت سے مبرا نسلی و لونی ملکی و وطنی بندشوں سے پاک ہو۔ اور وہ ذات

انسان کے عوامض و اندرون اس کی جملہ ضروریات انفرادی و اجتماعی سے کلیۃً واقف ہو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔

اللہ تعالیٰ جو قانون دے گا۔ وہ سب انسانیت بلکہ پوری مخلوق کو سامنے رکھ کر اور مستقبل کے وقائع و احوال کو جان کر دے گا۔ جس میں کسی کی رعایت نہیں ہوگی نہ کسی کا "خوف" عدل میں مانع آیا ہوگا۔ وہ ہر ذاتی مفاد سے خالی ہو کر محض مخلوق پروری اور انسانیت کی دادرسی کے لئے دیا جائے گا۔ اس میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ اس میں استحصال وغیرہ کے چور دروازے نہیں ہوں گے۔ اقبال نے بھی قانون الٰہی اور "قانون غیر" کے بارے میں خوب کہا ہے ؎

وحی حق بینندۂ سود ہمہ	در نگاہش سود و بہبود ہمہ
عادل اندر صلح و اندر مصاف	وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف
عقل خود بین غافل از بہبود غیر	سود خود بیند نہ بیند سود غیر
غیر حق چوں ناہی و آمر شود	زور ور بر ناتواں قاہر شود
حاصل آئین و دستور ملوک	دہ خدایان فربہ و دہقاں چوں دوک

غرض ملک میں عدل و انصاف کا چلن صرف اسلامی شریعت کے نفاذ سے ہو سکتا ہے تعزیز میں مذہبی قانون کے نفاذ کی اس وجہ سے بھی ضرورت ہے کہ "قانون" کی بالادستی کا تصور احترام قانون پر مبنی ہے۔ اور وہ قانون صرف "خدائی قانون" ہی ہے۔ جسے پاکستان کے مسلمان غیر شعوری طور پر بھی مقدس مانتے ہیں۔ قانون اسلامی کے جملہ فوائد بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم سمجھتا ہوں کہ یہ دو باتیں ہی تعمیر نو کے علم برداروں کی ثاقب نگاہوں کے لئے کافی ہوں گی ؎

اے چشم طوفان اشک لانے سے فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

سوالنامہ کے جواب میں

سلسلہ ۲

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
مفتی اعظم پاکستان مہتمم دارالعلوم کراچی

★

کرم فرمائے محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آپ نے مجھ ناکارہ کی علمی زندگی کے بارہ میں کچھ سوالات کئے ہیں۔ میں علم وعمل سے تہی دامن اسکا جواب کیا دیتا یہ خود ایک مسئلہ بنا ہوا تھا جسکی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔ آپ نے مولوی محمد تقی سلمہ کو مسلط فرما دیا جو جواب کے لئے یاد دہانی کیساتھ تاکید بھی کرتے ہیں۔ آج مجبور ہو کر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی علمی اور عملی زندگی کے جس باب اور جس پہلو پر نظر ڈالتا ہوں سب کوتاہیوں اور لغزشوں اور غلطیوں سے لبریز نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں میں دوسروں کو کیا بتاؤں۔

البتہ اللہ تعالیٰ کے انعامات اس ناکارہ پر بے حد و بے شمار ہوئے ان میں سب سے بڑا احسان یہ کہ اس نے ایک ایسے گھرانہ میں پیدا کر دیا جو اسلام و ایمان اور اس کے ساتھ دینداری میں معروف تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا دین کی باتیں بزرگوں کی حکایتیں کان میں پڑتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ایک ایسی جگہ پیدا فرما دیا جو علم اور دین کے اعتبار سے پورے ملک میں بلکہ شاید پوری دنیا میں ایک امتیازی مقام رکھتا تھا۔ یعنی دیوبند۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ ایسے راسخ العلم محقق علماء کو جمع فرما دیا تھا۔ جو علم کے ساتھ عمل اور تحقیق کے ساتھ اعتدال اور بلند نظری کیساتھ اپنے زمانے کے حالات پہ گہری نظر رکھنے والے تھے، وہ علماء ربانی صرف علماء نہیں۔ اولیاء اللہ بھی تھے، والد ماجد اسی دارالعلوم میں علمی عملی تربیت پاکر اس کے مدرس کی حیثیت میں تھے۔

قدرت نے اس سوال کی زحمت ہی سے بچا دیا کہ بچے کو تعلیم کے لئے کہاں بھیجیں۔ جب تک پڑھنے کے قابل نہ تھا۔ اس وقت بھی دارالعلوم کا صحن میرے کھیلنے کی جگہ تھی ہر طرف علماء صلحاء ہی پہ نظر پڑتی تھی۔ کوئی بھی بات کان میں پڑتی تو انہی بزرگوں کی۔

۱۳۲۵ھ میں جبکہ عمر کا ساتواں سال تھا۔ باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی اور ۱۳۶۲ھ تک اسی گہوارۂ علم و عمل میں رہنے کی توفیق ملی۔ میری علمی عملی زندگی کے

کبھی کوئی شعر میں کوئی تمیز کا پہلو ہے تو وہ سب ان بزرگوں کا فیض نظر ہے۔ میرا اپنا کچھ نہیں۔ عام مسلمانوں اور طلباء و علماء کیلئے کچھ مفید باتیں اور کلمات تبرک سے انہی بزرگوں سے سنے سناتے ہیں جن کو اپنے لئے بھی سرمایۂ سعادت سمجھتا ہوں۔ اور دوسرے اہل علم دوستوں کو بھی ان کا پہنچانا مفید سمجھ کر لکھتا ہوں۔ اسکی معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے سوالات کی ترتیب پر ان کے جوابات نہیں، مگر امید ہے کہ مقصد سوالات پر نظر کی جائے تو اس میں ان کے کافی جواب ملیں گے۔

مطالعہ کتب ۱۔ اصل یہ ہے کہ انسان کا معلم درحقیقت انسان ہی ہو سکتا ہے۔ کوئی کتاب خود معلم نہیں ہوتی۔ البتہ تعلیم تعلم میں معین مدد ہوتی ہے۔ اس لئے اصول کی بات یہ ہے کہ جس علم و فن کو حاصل کرنا مقصود ہو اس کا ماہر محقق استاد تلاش کیا جائے اور جب وہ مل جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت سمجھ کر اس سے اکتساب علم میں مشغول ہو، کسی کتاب کا مطالعہ بھی کیا جائے تو اسی معلم کی تجویز سے۔ تاکہ وہ اس کی استعداد اور ضرورت پر نظر رکھ کے اس کے لئے مطالعہ کی کتابیں تجویز کرے۔ خود رائی سے مختلف کتابوں کا مطالعہ وقت اور محنت بہت لے گا۔ فائدہ اتنا نہیں ہوگا۔ آجکل مدارس عربیہ میں استاد

سوالنامہ

۱۔ آپ کو علمی ذوق میں کن کتابوں اور مصنفین نے متاثر کیا اور آپ کی محسن کتابوں نے آپ پر کیا نقوش چھوڑے؟

۲۔ ایسی کتابوں اور مصنفین کی خصوصیت

۳۔ کن مجلات اور جرائد سے آپ کو شغف رہا۔ موجودہ صحافت میں کون سے جرائد آپ کے معیار پر پورے اترتے ہیں؟

۴۔ آپ نے تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ اور بزرگوں سے خاص اثرات لئے۔ ایسے اساتذہ اور بزرگوں کے امتیازی اوصاف جن سے طلباء کی تعمیر و تربیت میں مدد ملی۔

۵۔ اس وقت عالم اسلام کو جن جدید مسائل اور حوادث و نوازل کا سامنا ہے۔ اس کے لئے قدیم یا معاصر اہل علم میں سے کن حضرات کی تصانیف کارآمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں؟

۶۔ علمی، فکری اور دینی محاذوں پر کئی فتنے تخریبی، الحادی اور تجددی رنگ میں (مثلاً انکار حدیث، عقلیت، اباحیت، تجدد، مغربیت، قادیانیت اور سوشلزم) مصروف ہیں۔ ان کی سنجیدہ علمی احتساب میں کونسی کتابیں حق کے متلاشی نوجوان ذہن کی رہنمائی کر سکتی ہیں ــــ؟

۷۔ موجودہ سائنسی اور معاشی مسائل میں کونسی کتابیں اسلام کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔

۸۔ مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب اور نظام میں وہ کونسی تبدیلیاں ہیں جو اسے مؤثر اور مفید تر بنا سکتی ہیں۔

ــــ امید ہے اپنے مفید خیالات سے محروم نہیں کیا جائے گا ــــ

کا انتخاب طالب علم خود نہیں کر سکتا تو طالب علم کم
از کم یہی کر سکے کہ ایسے مدرسہ کا انتخاب کرے
جہاں وہ کتابیں جو اسکو پڑھنا ہیں ان کے ماہر
اساتذہ کے سپرد ہوں۔ پھر جس استاد کو اپنے
مطلوب فن میں زیادہ ماہر سمجھے اس سے استفادہ
کا سلسلہ قائم کرے خواہ سبق اس کے پاس ہو یا
نہ ہو۔

۲۔ اس زمانہ میں تصنیف تالیف کتابوں
کی اشاعت اتنی عام ہے کہ احاطہ دشوار ہے۔
ہر اہل و نا اہل تصنیف میں لگا ہوا ہے۔ ان میں
ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآن و سنت میں تحریف
کرتے ہیں، اور بے دین و ملحد بھی ہیں، اس لئے اس
زمانے میں کتابوں کے مطالعہ کیلئے مناسب صورت
یہ ہے کہ عوام کسی عالم سے اپنے مناسب حال
کتابیں مطالعہ کی تجویز کرائیں اور طلباء اپنے اساتذہ
سے۔ اور جہاں مطالعہ میں کوئی اشکال پیش آئے
اسکو اپنی رائے سے حل نہ کریں، بلکہ عوام علماء
سے اور طلباء اساتذہ سے تحقیق کر کے رفع
کریں۔

اگر یہ طریق اختیار نہ کیا گیا تو بیشمار کتابیں
دیکھنے اور بڑی محنت کرنے کے بعد کچھ علم
آئے گا وہ بھی قابل اطمینان و اعتماد نہیں ہو گا۔

۳۔ جس کتاب کا مطالعہ کرنا ہو پہلے اس
کے مصنف کا حال معلوم کیجئے کہ جس موضوع پر
یہ کتاب ہے اس فن میں مصنف کی مہارت
کس حد تک ہے۔ اگر مصنف ہی کی مہارت فن کی
تحقیق نہ ہو تو اپنے وقت اور محنت کو اس کے
پیچھے ضائع نہ کریں۔ اور اگر کتاب دینیات سے متعلق
ہے تو مصنف کے علمی مقام کے ساتھ اس کی عملی اور
اخلاقی زندگی کی بھی تحقیق مناسب ہے۔ کیونکہ تجربہ
شاہد ہے کہ علوم دین میں بے عمل آدمی کی تصنیف
اور کلام میں وہ اثر نہیں ہوتا جو متقی علماء کی تصانیف
میں ہے۔

۴۔ عام مسلمان جو دین کا کافی علم نہ رکھتے ہوں
وہ فرق باطلہ کی کتابیں اور ملحدین اور بے دین لوگوں
کے مضامین ہرگز نہ دیکھیں کہ جسطرح بے دینوں
کی مجالست اور صحبت بڑا اثر ڈالتی ہے اسی
طرح ان کا کلام اور تصنیف بھی بلکہ بعض اوقات
اس کا اثر صحبت و مجالست سے بھی زیادہ
مضر ہوتا ہے۔

۵۔ اہل علم میں بھی صرف وہ حضرات ملحدین
اور فرق باطلہ کی کتابوں کا مطالعہ کریں جنکو ماہر اساتذہ
کی صحبت سے علم میں رسوخ حاصل ہو چکا ہے۔
اور وہ اپنے وسائل کے اعتبار سے دفاع عن الاسلام
کی خدمت انجام دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں
مثلاً تحریر، تقریر اس درجہ میں ہو کہ حق بات کو دلنشین
انداز میں فریق مخالف کے نفسیات پر توجہ کر کے
بیان کر سکیں جو لوگ یہ اتنی استعداد نہیں رکھتے
یا ان کو ایسے لوگوں سے سابقہ نہیں پڑتا، وہ
فضول اپنا وقت اور محنت ان کتابوں کے مطالعہ

بجائے صرف کرنے کے بجائے ان کتابوں کا مطالعہ کریں جو اپنے لئے بھی اصلاح نفس کا ذریعہ ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ان کی تعلیم و تبلیغ مفید ہے۔

ہمارے اکابرؒ فرمایا کرتے تھے کہ درس نظامی سے فراغت کا حاصل اتنا ہے کہ اس کے فاضل میں مطالعہ کی ایسی استعداد پیدا ہو گئی ہے کہ استاد کی مدد کے بغیر بھی مطالعہ کر کے استفادہ صحیح کر سکتا ہے یہ نہیں کہ ضرورت کے سب علوم اور سب معلومات درس نظامی میں پورے حاصل ہو چکے یہ ایک ایسی بات ہے جو اکثر درس نظامی کے فارغ التحصیل لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس لئے ایک عالم کے شایان شان خدمت میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ایسے علوم میں خصوصیت سے تاریخ، جغرافیہ اور تصوف ہے جو درس نظامی میں درساً نہیں پڑھائے جاتے لیکن درس نظامی کی صحیح استعداد پیدا کر لینے والا اگر مطالعہ کرے اسی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مدارس سے فارغ التحصیل حضرات ان فنون کا مطالعہ اہتمام سے کریں۔ خصوصاً تصوف یعنی اصلاح نفس سے متعلق کتابوں کے مطالعہ کو وظیفۂ زندگی بنائیں جس کے بغیر علم دین کا مقصد حاصل ہوتا ہے نہ تعلیم و تبلیغ میں برکت پیدا ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں امام غزالیؒ کی کتابیں عموماً اور بالخصوص بدایۃ المبتدی، تعلیم دین، فاتحۃ العلوم اور احیاء العلوم کی جلد رابع، علامہ ابن قیم کی کتاب الجواب الکافی عن الدواء الشافی، اور کتب متقدمین میں سے رسالہ قشیریہ اور عوارف المعارف وغیرہ اور آخری دور میں حکیم الامت سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تصانیف تعلیم الدین، التشرف، قصد السبیل، انفاس الاقوال وغیرہ اور آپ کے مطبوعہ مواعظ و ملفوظات اس معاملہ میں اکسیر ثابت ہوئے ہیں۔

رہا معاملہ موجودہ نصاب مدارس میں اصلاح و ترمیم کا تو اس کے لئے انفرادی رائیوں کی اشاعت شاید مفید نہ ہو۔ یہ کام مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کے اشتراک اور باہمی بحث و تمحیص کے بعد ہی کوئی مفید صورت اختیار کر سکتا جس سے مدارس عربیہ کے نصاب میں ہم آہنگی اور اشتراک باقی رہے۔

آپ کے سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ "آپ نے تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ اور درسگاہوں سے خاص اثرات لئے، ایسے اساتذہ اور درسگاہوں کے امتیازی اوصاف"

اس میں جہاں تک درسگاہوں کا تعلق ہے وہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ صرف ایک درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں بچپن سے پچپن تک عمر گذاری ہے اس کی خصوصیت محتاج بیان نہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں اور بیرونی ممالک میں بھی اسکی علمی ساکھ ہمیشہ مسلّم رہی ہے اور جس چیز نے اسکو دنیا کی دوسری درسگاہوں سے ممتاز کیا وہ علم کے ساتھ عمل کی جامعیت ہے۔ میرے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحبؒ فرماتے تھے

کہ ہم نے دارالعلوم کا وہ زمانہ دیکھا جبکہ اس کے مہتمم اور صدر مدرس مدرسین سے لیکر ایک چپراسی اور دربان تک سب اولیاء اللہ تھے۔ دارالعلوم دن بھر قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے گونجتا تھا۔ تو رات کو جگہ جگہ سے تہجد میں تلاوت قرآن اور ذکر اللہ کی دلنواز صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ اور اساتذہ جن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کی دولت حق تعالیٰ نے اس ناکارہ کو نصیب فرمائی، ان کے امتیازی اوصاف بیان کرنا تو اس ناکارہ کے بس کی بات نہیں۔ قلم جب یہاں پہنچتا ہے تو ایک طرف محبت کا داعیہ قلم کے افتاد کو خود بخود تیز کرنا چاہتا ہے ؎

این زمان جان دامنم را تافت ست
بوئے پیراہن یوسف یافت ست

دوسری طرف ان بزرگوں کی عظمت اور ان کے کمالات علمی و عملی کی وسعت سے اپنے دامن فکر و نظر کو تنگ پاتا ہوں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ میرے سب قویٰ جواب دے چکے ہیں۔ عمر کے آخری ایام لیٹ بیٹھ کر گذار رہا ہوں۔

ذرا غور کیجئے کہ ان حالات میں اپنے اساتذہ شیخ العرب والعجم استاذ الکل حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند نور اللہ مرقدہ حجۃ الاسلام والمسلمین حضرۃ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور عارف باللہ حضرۃ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، عالم ربانی حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دوسرے طبقہ میں حضرۃ مولانا اعزاز علی صاحب حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب حضرت مولانا رسول خان صاحب جیسے اساطین امت بزرگوں کے امتیازی اوصاف پر قلم اٹھاؤں تو سمندر کو تیراکی کے ذریعہ پار کرنے کی مثال سے کیا کم ہوگی۔ اس وقت تو بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ؎ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

اور یہ کہ ؎

تولائے مردان ایں پاک بوم
برانگیختم خاطر از شام و روم

اور یہ کہ ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
رفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی معیت آخرت میں نصیب فرما دیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ ★

★ میری علمی و مطالعاتی زندگی کے زیر عنوان اگلے شمارہ میں عالم اسلام کی ممتاز علمی دینی اور ادبی شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا طویل بیان ملاحظہ فرمائیں۔

★ مضمون نگار حضرات کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ الحق کے مضامین کا مسودہ کاغذ کے ایک طرف خوشخط لکھ کر بھجوائیں۔ اس سے عمدہ کتابت اور دلکش ترتیب میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(کاتب الحق)

دعوات عبدیت و حق
ضبط و ترتیب : ادارۃ الحق

ارشادات شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہٗ

علماء کا اصل کام

اصلاحِ اُمّت

یہ تقریر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے ۲۹ اپریل ۱۹۷۲ء کو دیہی ترقیاتی اکیڈمی پشاور کے دو روزہ علماء کنونشن میں ارشاد فرمائی اور بڑی خوبی سے کنونشن میں شریک علماء کا رخ علماء کے کرنے کا اصل کام اصلاحِ امت اور فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی کی طرف موڑ دیا۔

(ادارہ)

(نحمدہ ونصلی) قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم العلماء ورثۃ الانبیاء (الحدیث)
حضورؐ نے فرمایا علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔

محترم بزرگو! علماء کا اونچا مقام ہے خاص کر امت محمدیہ علی صاحبہا الف الف سلام وتحیۃ کے علماء کا یہ حضورؐ کے ارشاد علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ کے مصداق ہیں۔ اور وارث کو وہ چیز میراث میں ملتی ہے جو مورث کے پاس ہوتا۔ دولت جس نے حاصل کی وہ قارون کا وارث بنا سلطنت اور حکومت تو فرعون ہامان اور شداد وسر لینی کو بھی ملی۔ اگر کسی نے صرف یہ چیزیں حاصل کیں تو ان کی میراث کو پالیا، مگر وہ پیغمبر کا وارث نہیں ہو سکتا۔

ہمارے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی نے ایسے حالات میں مکہ مکرمہ میں حق کی آواز بلند کی۔ کفار لالچ دیتے رہے۔ حضرت ابوطالب کے پاس جاکر شکایت کرتے۔ حضورؐ اپنے چچا کو کہتے کہ میری وجہ سے قوم کا بوجھ مت اٹھائیں، میں اللہ کے بھروسہ اور اعتماد پہ کھڑا ہوا ہوں۔ اور اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند بھی رکھ دیں اور کہہ دیں کہ ایک ایسی راہ اختیار کروں جو ذرا سی بھی اعتدال سے ہٹی ہوئی ہو تو ہرگز نہ کر سکوں گا۔

قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ	مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ دین کی کسی بات کو اپنی مرضی سے تبدیل کر سکوں میں تو اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پہ آتی ہے۔

پھر اس امت نے حضورؐ کے ایسے نمونوں اور اصولوں کو اپنا کر قرآن وسنت کی برکت سے قیصر و کسریٰ کی سلطنت ختم کی تو اولین امت کی اصلاح جن طریقوں سے ہوئی انہی طریقوں سے ہماری حالت بھی بدل سکتی ہے۔ انہوں نے کالج اور یونیورسٹیاں نہیں پڑھی تھیں کارخانے نہ تھے، بدر میں چند تلواریں اور چند کمان مسلمانوں کا سارا اثاثہ تھے۔ مگر ان کے جذبات یہ تھے کہ حضورؐ نے جب بدر میں راستے معلوم کرنا چاہی کہ تم ۳۱۳ ہو کفار تمام اَلسلاح اور مسلح ہیں۔ کیا خیال ہے۔ ان سے مقابلہ ہو جائے یا نہیں ۔۔۔، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہؐ ہم بنی اسرائیل کیطرح نہیں کہ آپ کو کہہ دیں کہ اذھب انت وربك فقاتلا انا ھھنا قاعدون۔ (تو اور تیرا رب جا کر لڑے ہم تو یہاں ہی بیٹھے رہیں گے۔) نہیں بلکہ انا نقاتلك من یمینك وعن شمالك وعن یسارك ۔۔۔ الخ ہم تو آپ کے آگے پیچھے داہنے بائیں لڑیں گے۔ تو فتح بھی خدا نے دی کہ اس کا وعدہ ہے کہ: ان تنصروا الله ینصرکم۔ اگر تم اللہ کے دین کی مدد کروگے۔ تو اللہ تمہاری نصرت کرے گا۔ تم خدا کی مدد کیلئے کمربستہ ہو جاؤ، خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اگر یہ خیال ہو کہ شاید اس وقت دشمن موجودہ زمانہ کی طرح کا طاقتور اور مسلح نہ ہوگا۔ تو نہیں۔ اپنی تاریخ پڑھ لو۔ ایک جنگ یرموک میں لاکھوں مسلح کافروں سے مقابلہ ہوا، کئی ہزار زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے کہ بھاگنا بھی چاہیں تو نہ بھاگ سکیں۔ وہ ہے کی دیوار بن گئے تھے۔ ان کے پاس طاقت تھی۔ مگر مسلمانوں نے ان کی صفوں کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اس وقت اللہ کی مدد مسلمانوں کے ساتھ رہی۔

۔۔۔ تو بھائیو! آپ کا مقام بہت اونچا ہے۔ ان فتنوں کے دور میں گھبرائیں نہیں صحابہ کرامؓ کی حالت سامنے رکھیں کہ وہ حضورؐ کے سچے وارث تھے۔ حضرت خبابؓ کی پیٹھ ایک دفعہ ننگی ہوگئی، حضرت عمرؓ موجود تھے دیکھا تو ایسے زخموں کے نشان تھے کہ نہ تیروں کے معلوم ہوتے تھے، نہ تلوار کے بڑے بڑے چھالے اور گڑھے سے بن گئے تھے، وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میرا مالک میرے اسلام لانے کی وجہ سے مجھے دہکتے انگاروں پر لٹا دیتا۔ اوپر چند آدمی بٹھا دیتا کہ اٹھ کر بھاگ نہ سکوں اور جسم سے خون اور پانی رس رس کر جب تک انگاروں کو بجھا نہ دیتا تب تک مجھے اسی حالت میں رکھا جاتا۔ انہی حضرت خبابؓ کا سر مبارک دشمن کے ہاتھوں زخمی ہوا، حضورؐ سے شکایت کی، حضورؐ کا چہرہ مبارک سرخ ہوا اور فرمایا اے خباب، تم تو میری امت میں سے ہو، تم سے پہلے تو اسلام کی خاطر لوگوں کو آروں سے چیرا گیا۔ مگر اُف تک نہ کی، تمہیں اتنی گھبراہٹ کیوں ہے۔ پھر حضورؐ نے فتح کی بشارت دی کہ یہاں سے صنعاء یمن تک ایک عورت اکیلے سونا لئے جا رہی ہوگی اور اسے کوئی

ڈر نہیں ہوگا۔ یہی بشارت تھی کہ حضرت عمر عثمان علی رضی اللہ عنہم کا دور آگیا۔ ۲۳ سال میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔

انا فتحنا لک فتحا مبینا (ہم نے تجھے بہت بڑی فتح دی) کا ظہور ہوا۔ مگر ہم نے اپنے ملک میں وہ جھنڈا جو چودہ سو سال سے لہرایا تھا، ۲۴ سال میں سرنگوں کر دیا۔ اور سات کروڑ مسلمانوں کو ہندو کے سپرد کر دیا۔ پھر کہئے کیا ہم بھی وارث ہیں۔ ذات اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لہرایا اور ہمارے سپرد کر کے حکم دیا کہ اب آگے بڑھتے رہو، مگر ہم نے ۲۴ سال میں اسلامی مملکت کا اہم حصہ کافروں کے سپرد کر دیا بھائیو! آج آپ کی یہ تمام کوششیں قابل ستائش ہیں۔ مگر جب مرض کی تشخیص نہ ہو اور برائی کی جڑ نہ کاٹیں گے تو علاج کارگر نہیں ہو سکے گا۔ ہسپتال کارخانے ترقیاتی منصوبے سب کچھ ہو رہا ہے۔ ہم کہتے ہیں جزاک اللہ اور بھی ترقی کرتے رہو۔ مگر ہم دین کے خدام اور آپ حضرات علماء کا مقام اور کام تو یہی ہے کہ حضورؐ کے دین کو لیکر امت کی اصلاح و فلاح کے لئے کمربستہ ہو جاؤ کہ اسی طریقہ پر چل کر ہماری ترقی ہے۔ لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا۔ اس امت کا آخری دور بھی انہی طریقوں سے درست ہوگا جس طرح اگلے دور کی اصلاح ہوئی۔

یہ دو ڈھائی سو علماء کا مجمع اگر اپنے اپنے دیہات میں پھیل کر اصلاح کے کام میں لگ جائے، اور سب سے پہلے لوگوں کے دلوں میں خدا کے خوف کے جذبات ابھاریں کہ راس الحکمۃ مخافۃ اللہ (دانائی کی جڑ اللہ کا خوف ہے) تو کتنی اصلاح ہو سکتی ہے۔ قبل از اسلام عربوں کی زندگی کتنی خراب تھی کہ ہماری موجودہ خرابی بے حساب ہونے کے باوجود دور جاہلیت تک نہیں پہنچ سکتی۔ ان طریقوں سے جسے حضورؐ نے اختیار کیا۔ ان کی ایسی اصلاح ہوگئی کہ اس معاشرہ میں سے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ حضرت خالدؓ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ کوئی ماؤزے تنگ، کوئی شکسپیر اور کوئی نکسن کے پیچھے جاتا ہے، تو جائے، ہمارا ماویٰ و ملجا تو ذات وحدہٗ لاشریک اور ہمارا اسوۃ و نمونہ تو اس کا پیغمبرؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ ہیں۔ الغرض پہلا فریضہ ہمارا یہ ہے کہ ہم اپنے دیہات میں پھیل کر وراثت نبوت کا کام سنبھالیں۔ اس راہ میں کسی چیز کی پرواہ نہ کریں، نہ طمع و لالچ ہو۔ اور نہ دنیا مطمح نظر ہو۔ حضورؐ نے حق کی آواز بلند کی اور جاتے وقت دنیا پر اسلام کی سلطنت قائم فرمائی مگر دنیا سے رحلت کے وقت زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس چند سیر جو کے عوض گروی ہے۔ انبیاء اجر کے طلبگار نہیں ہوتے قل لا اسئلکم علیہ اجرا ان اجری الا علی رب العالمین ۔ تمہیں جب علم کی دولت اور عزت حاصل ہے تو اس سے بڑھ کر عزت اور دولت کیا ہو سکتی ہے۔ لوگوں کا اس کا اندازہ نہیں

ہے۔ اس لئے اور چیزوں کو مقصود بنا دیتے ہیں وللّٰہ العزۃ ولرسولہ ولکن المنافقین لایعلمون۔
ہمارا فریضہ ہے کہ جذبۂ اخلاص وللہیت سے اس قوم کی اصلاح میں لگ جائیں اور جسطرح نماز، روزہ،
حج، زکوٰۃ، اخلاق حسنہ اور احساس آخرت کا درس امت کو دیں۔ اسی طرح عملی نمونہ بھی ان تمام باتوں کا
امت کو بتلائیں۔ اور دنیا کے کام بھی ایک مثالی نمونہ بن کر ان کے سامنے پیش کریں۔

علماء کو تجارت اور دنیوی کاموں سے بھی نہیں روکا گیا مگر ان کی تجارت بھی کیسی ہوگی۔؟ امام
ابوحنیفہؒ ریشم (خز) کے تاجر تھے۔ ایک بوڑھی عورت آئی، ایک ریشمی چادر خریدی، قیمت پوچھی
اور کہا جس قیمت پہ پڑی ہے اسی قیمت پر دیدو۔ امامؒ نے فرمایا چار درہم۔ بڑھیا حیران رہ گئی
اور کہا کیوں بھئی تمسخر کرتے ہیں۔ اتنی ہلکی قیمت بتلائی۔ فرمایا نہیں ایسا نہیں۔ میں نے دو چادریں
خریدی تھیں، ایک بک گئی اور یہ چادر چار درہم میں رہ گئی ہے۔ جب تم نے اصل قیمت پر لینا چاہا تو
چار درہم ہی پر دوں گا۔

امام بخاریؒ کے ہاں مال تجارت آیا۔ عصر کے بعد سوداگر آگئے اور کہا کہ مرابحہ کرو۔ ۵ ہزار نفع
دیتے ہیں۔ فرمایا کل تک رہنے دو۔ وہ لوگ واپس گئے کل اور مشتری آئے اور دس ہزار نفع پیش کیا
اسی مال کا۔ امامؒ نے فرمایا نہیں دس ہزار نہیں لے سکتا۔ کل شام دوچار تاجر مجھے ۵ ہزار روپیہ منافع
دینے لگے تھے۔ گو عقد نہیں ہوا تھا۔ مگر میرا قلبی میلان دینے کا ہوگیا تھا۔ تو اب انہیں ۵ ہزار ہی پہ دوں گا۔
دس ہزار پہ نہیں دے سکتا۔ تو یہ ہے عالم کی شان۔

اسی طرح مواریث الانبیاء (علم اور علوم نبوت اور سیرت طیبہ) کا وقار رکھنے صرف اللہ کی رضا
مدنظر رہے۔ علم کو ذلیل نہ ہونے دیں۔ امام بخاریؒ کو حاکم بخارا دعوت دیتا ہے کہ میرے پاس آکر مجھے درس
دیا کریں۔ جواب میں کہا کہ یہ علم بڑی اشرف چیز ہے۔ اس کے پیچھے لوگ آتے ہیں۔ علم کسی کے پیچھے نہیں
پھرتا۔ بادشاہ نے کہا کہ میرے شہزادوں کو ایک سپیشل کلاس دو جس میں عام لوگ اور پردیسی غریب الدیار
طلبہ نہ ہوں۔ فرمایا یہ حضورؐ کی میراث ہے جنہیں اللہ نے حکم دیا تھا کہ :

واصبر نفسك مع الذين يدعون	ان لوگوں کے ساتھ اپنے نفس کو روکے رکھو
ربهم بالغداة والعشي يريدون	صبح شام اللہ کی رضا کے لئے اسے پکارتے
وجهه۔	ہیں۔ (اور ذکر و فکر ہی ان کا مشغلہ ہے)

تو اس میں یہ تقسیم نہیں کر سکتا۔ امیر بخارا خفا ہوگیا اور بخارا سے جلاوطنی کا حکم دیدیا۔ امامؒ چلے گئے اور
باہر ہی دفن ہوئے۔ مگر وقار علمی قائم رکھا امام بخاری تھے ایک طرف دین کی اشاعت میں لگے رہے۔

دوسری طرف ورثے نظریاتی دین کی حفاظت کی

بھائیو! ملت کی خیر خواہی ہمارا سب سے اہم فریضہ ہے۔ ہم پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آدھا ملک چلا گیا ہے۔ اس شرمناک شکست کی وجہ سے جو ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ مگر بہت سے جاہل اذہان اس حادثہ سے اسلام سے پھرنے لگے ہیں۔ حالانکہ یہ اسلام کی شکست نہیں تھی — ہمیں ذہنوں کی اصلاح کرنی ہے اور لوگوں کے عقائد کو سنبھالا دینا ہے، وہ کتاب اور وہ سنت پھیلانی ہے جس کی وجہ سے ہمارے اسلاف دنیا و آخرت میں سرخرو ہو گئے۔ اسلام کے اخلاق و اقدار پیش کریں۔ اسلام کی تجارت اسلام کی زراعت پیش کریں۔ اسلام کا طرزِ حکومت پیش کریں۔ اللہ تعالیٰ جو بے حد مہربان ہیں۔ ایسا ہی رحم فرمائیں گے جیسے اگلوں پر فرمایا۔

میری دعا ہے کہ دیہی ترقیاتی اکیڈمی کے ان مساعی کو بھی اللہ تعالیٰ دین و ملک کے لئے مفید بنا دے۔ قومی تعمیر تو بہت بہتر ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ قوم کو نئے تمدن اور نئی تہذیب کے سانچوں میں ڈھال دیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ انگریز کے وقت سے لیکر اب تک عیسائیت، مغربیت اور لادینی کے جتنے بھی اثرات پیدا ہوئے ہیں۔ ان کو مٹا دیا جائے اور حضورؐ کے لائے ہوئے دین اور شریعت کے مطابق فرد اور معاشرہ کی تعمیر کی جائے۔ چودہ سو سال قبل کا دین اپنایا جائے جس کی بدولت ہمیں عزت اور کامرانی ملی تھی۔ اور صحابہؓ نے جس دین کے اخلاق عقائد عبادات اور طہارت ظاہر و باطن کے ذریعہ امداد خداوندی کی قوت حاصل کی اور حضورؐ نے تو ہماری حالت پر رحم فرماتے ہوئے یہاں تک فرمایا کہ میرے صحابہؓ نے اگر کسی مامور بہ کا دسواں حصہ بھی چھوڑا تو ماخوذ ہوں گے۔ ——— اور ان کے بعد آنے والوں نے اگر مامور بہ کے دسواں حصہ پر بھی عمل کیا۔ یعنی ۱/۱۰ درجے کا اخلاص بھی، اگر عمل میں ہو تو کامیابی کا باعث ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ فرائض اور واجبات کے ۹ حصے چھوڑے۔ نہیں بلکہ صحابہؓ کے عمل میں دس کے دس حصے اخلاص ضروری تھا۔ ہم اتنے مخلص نہیں ہو سکتے اور ۱/۱۰ حصے اخلاص بھی آ جائے تو ان شاء اللہ کامیاب ہوں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مولانا قاضی عبدالکریم صاحب امیر جمعیۃ العلماء اسلام
ڈیرہ اسماعیل خان
مہتمم مدرسہ نجم المدارس کلاچی

کیا عائلی قوانین قرآن و سنّت کے مطابق ہیں ؟

اُم وزیر قانون کے نام کھلا خط!

اس حقیقت سے انکار کی کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ شرمناک شکست کے بعد عوام کے دینی جذبات کا خیال رکھنا کسی بھی کامیاب حکومت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مشرق، پشاور مورخہ ۲/۲ کے مطابق آپ نے ڈیرہ بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے۔ غالباً اس احساس کے پیش نظر یہ فرمایا ہے کہ پیپلز پارٹی قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنائے گی۔ اخبارات کے مطابق صوبہ بلوچستان ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن میں بھی آپ نے اسی قسم کا اعلان کیا ہے لیکن ڈیرہ بار ایسوسی ایشن میں اسی اعلان کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ عائلی قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ بقول

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ایک سانس میں یہ دو اعلان کہ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا، اور عائلی قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی، قول و عمل میں یا دو باتوں میں تضاد کا عجیب سا شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ آپ جیسی باخبر عوامی شخصیت کو مردود زمانہ عائلی قوانین سے متعلق عوام کے دینی جذبات کا علم نہ ہو۔ سابق صدر ایوب کی جابرانہ مارشل لاء کی موجودگی میں عوام نے ان قوانین سے جسطرح کھلی نفرت کا اظہار کیا۔ اور ان رسوائے زمانہ قوانین کا جس طرح عملی بائیکاٹ کیا۔ شاید ہی وہ کسی سے پوشیدہ ہو۔ یہ قرآن و سنت سے ان قوانین کا کھلے طور پر منافی ہونا صرف یہ کہ مجمل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کے ایک ایک دفعہ کو قرآن و سنت اور مذاہب اربعہ کے منافی ہونے پر مفصل بحث ہوئی پمفلٹوں اور رسالوں کی شکل میں انہیں شائع کیا گیا۔ اخبارات میں اور دینی ماہناموں میں اسے چھاپا گیا قومی اسمبلی میں مفتی محمود صاحب نے سترمنٹ تک اس پر بحث کی جسے سپیکر نے فاضلانہ تقریر قرار دیا۔ اور

نتیجۃً پوری اسمبلی نے اس کے بخلاف اسلام ہونے کو مان لیا۔ بین الاسلامی کانفرنس میں اس پر بحث ہوئی اور مخالفین کو دلائل کے لحاظ سے خاموش ہونا پڑا۔ اس کے باوجود کتنی تعجب کی بات ہے کہ اس دعوی کے ساتھ کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا، کھلے ننظوں میں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ عائلی قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

عائلی قوانین کے خلاف عوامی جذبات کا سرسری جائزہ

۱۔ ان قوانین کی ایک ہی دفعہ صغیر السن بچوں اور بچیوں کی شادی (ساردا ایکٹ) کا جو حشر انگریز کے زمانہ میں ہوا۔ اور دنیائے اسلام کے مایۂ ناز وسیع النظر شخصیتوں امیر الہند والحجاز شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی، امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ وغیرہم نے ان قوانین کو جو بھرپور مخالفت کی وہ ہند و پاک کے کسی مسلمان سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۲۔ ۱۹۵۶ء میں ایک کمیشن نے جب انہیں قوانین کا مسودہ پیش کیا تو کون نہیں جانتا کہ عوامی زبردست احتجاج سے خائف ہو کر حکومت نے اسے سرد خانہ میں ڈال دیا۔

۳۔ عہد ایوب کی جابرانہ مارشل لاء کے باوجود ۲۵ مارچ کو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ ہزاروں علماء کی سرکردگی کرتے ہوئے لاہور میں جلسۂ عام کے دوران اعلان فرماتے ہیں: "او ایوب خان سن لو اگر تم ان غیر اسلامی عائلی قوانین اور خاندانی منصوبہ بندی کو منسوخ نہیں کرو گے تو پوری قوم انہیں ٹھکرا دے گی۔"

۴۔ علماء اسلام نے مسلک و مشرب سیاست حتیٰ کہ مذہب میں مختلف ہونے کے باوجود سب نے بالاتفاق انہیں مردود قرار دیا۔

۵۔ سینکڑوں بی ڈی ممبروں کے ایک عظیم کنونشن منعقدہ لاہور میں اس کے خلاف سخت احتجاج ہوا۔ اخبارات کے مطابق اس احتجاج میں سخت اشتعال تھا۔

۶۔ قومی اسمبلی کے تمام اراکین بشمول جناب اقتدار نے مولانا مفتی محمود صاحب کی فاضلانہ تقریر کے بعد ان قوانین کے خلاف اسلام ہونے کو مان لیا۔ اور اس میں علماء کے مشورے سے ہی ترمیمات کا بل پیش کیا اگرچہ حکومتوں کے روایتی دوغلا پن کی وجہ سے آخر تک اس عہد کو پورا نہیں کیا گیا۔ (ملاحظہ ہو قومی اسمبلی منعقدہ راولپنڈی کے اجلاس کی کارروائی۔)

۷۔ مغربی پاکستان کے تمام اراکین نے مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی کی تحریک پر ان قوانین کو ختم کرنے کی متفقہ پر زور سفارش کی۔ (ملاحظہ ہو صوبائی اسمبلی ۳۰ جولائی ۱۹۶۳ء کی کارروائی)

۸۔ سرحد سے جماعت ناجیہ۔ نے سینکڑوں بی ڈی ممبروں اور لاکھوں مسلمانوں کے دستخطوں سے اس کے خلاف محضر نامہ تیار کرکے صدر کو بھیجا۔

۹۔ دینی ماہناموں اور ہفت، روزوں نے اس کے خلاف پر زور اداریئے لکھے۔

۱۰۔ سرحد اور بلوچستان میں خصوصیت سے ان قوانین کا مکمل بائیکاٹ کیا گیا۔ آج بھی اگر صحیح طریقے سے تحقیق کرائی جائے تو معلوم ہوگا کہ کئی یونین کونسلوں نے اس کا بائیکاٹ کردیا تھا۔ نکاح رجسٹراروں کے رجسٹر خالی نظر آئیں گے۔ بہت سی ایجنسیوں کو اس سے مستثنٰی کرنا پڑا۔ بعض شہری علاقوں کے علاوہ۔ (جہاں کرایہ دار نکاح خوان مل جاتے ہیں یا فرضی طور پر فارم پُر کرلئے جاتے ہیں۔) عوام نے قطعاً اس کا بائیکاٹ کیا۔ حتیٰ کہ بعض مقامات پر لوگوں نے ایسے رشتہ داروں کے نکاحوں میں شرکت کرنا بھی چھوڑ دیا جس میں نکاح فارم پُر کئے جاتے ہیں اس کے لئے تحریری معاہدے کئے اور شائع کر دیئے گئے۔ ابتداء میں جب صدر ایوب کی جابرانہ مارشل لاء میں حکام نے سختی سے کام لیا تو علماء اور عوام نے ان خلاف اسلام قوانین پر عمل کرنے کی بجائے جیل میں جانے مقدمات میں پیش جانے جرمانے ادا کرنے کو ترجیح دی مگر احکام اسلام سے بغاوت نہیں کی۔ (ملاحظہ ہو ڈیرہ اسماعیل خان اور پشاور کی عدالتی کارروائیاں از ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۶ء)

یہاں پر یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک ان قوانین کے خلاف مسلسل اور مفصل لکھا جاتا رہا۔ مگر کسی معتمد آزاد عالم دین یا کسی آزاد دینی ادارہ سے اس کی کوئی مخالفت نہیں ہوئی۔ کوئی آواز اٹھی بھی تو صرف سرکاری ادارہ سے اور صدر کی مشاورتی کونسل کے بعض ان افراد کی جانب سے جن کا سلسلہ سند عموماً مستشرقین یا مغرب زدہ حضرات سے جا ملتا ہے اور بس۔

بہرحال عائلی قوانین کے خلاف عوام کے دینی جذبات کا یہ سرسری اور نامکمل جائزہ ہے نہ معلوم عوامی حکومت کے ذمہ دار حضرات عوام کے ان ٹھکرائے ہوئے قوانین کے تحفظ کا آخر کس طرح ارادہ کر رہے ہیں۔ جو قوانین عوام کے نمائندوں کے سامنے تک نہ آسکے اور مارشل لاء کے ڈنڈا سے نافذ کئے گئے۔ عوامی حکومت کو کس طرح بھی زیبا نہیں کہ ان کے نام سے بھی اپنی زبان کو گندہ کریں۔

قرآن و سنت سے ان قوانین کا کھلا تصادم

اسی بیان میں آنجناب نے اس نیک عزم کا اظہار کیا ہے کہ پیپلز پارٹی قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنائی گی۔ اسے عوام کے دینی جذبات کا احترام کہئے یا اسپنے ہی اسلام کا تقاضا بہر صورت ارادہ نیک ہے اس کے ساتھ لازماً آپ کا اور آپ کی پارٹی کا یہی ارادہ ہوگا کہ سابقہ قوانین بھی جو قرآن و سنت کے منافی ہیں ان کو بدل دیا جائے گا۔ کیونکہ جن عوام کا یا جس مسلمان کے اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہ بنایا جائے انہیں عوام اور ان کے اسلام کا یہ بھی شدید تقاضا ہے۔ کہ قرآن و سنت کے منافی موجودہ قوانین کو بھی جلد از جلد ختم کر دیا جائے۔ گذشتہ جائزہ میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ملک کے ہر طبقہ اور ہر مسلک کے قرآن و سنت کو سمجھنے والے افراد نے ان قوانین کو قرآن و سنت کے منافی ہی سمجھا ہے۔ اس لئے اس پر اب مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ــــــ۔

تاہم آپ کے بیان سے چونکہ اس فتنہ کو از سر نو تحفظ مل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے بطور نمونہ صرف آپ کے استفسار کے لئے ان قوانین کے دو تین دفعات کا قرآن و سنت سے یہ کھلا تصادم بیان کر دینا بے محل نہیں ہوگا۔ اس پر باقی دفعات کو قیاس کیا جائے۔ چنانچہ عرض ہے کہ:

۱۔ عائلی قوانین میں مطلقہ کی عدت نوے دن مقرر کی گئی ہے جبکہ قرآن کریم کی صریح نص میں ثلثہ قروء (یعنی تین دفعہ ایام ماہواری) کا لفظ موجود ہے۔ ثلثہ قروء کے معنی نوے دن یا تین ماہ کسی لغت میں نہیں لئے گئے۔ اور اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں بھی کسی مسلمان نے یہ معنی نہیں کئے۔ یہ جرأت صرف عائلی قوانین کے مصنفین کو ہوئی ــــــ اور اس کے باعث جو خرابیاں پیش ہوں گی وہ معمولی نہیں بلکہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینا پڑے گا۔ مثلاً جس عورت کو طلاق کے بعد تین دفعہ ماہواری تو نہیں آئی مگر نوے دن اسکی طلاق کو گزر گئے ہیں۔ اب قرآن کریم کی رو سے اس کا دوسری جگہ نکاح کرنا حرام ہوگا اور اگر کر لیگی تو منعقد نہیں ہوگا اور اس نئے خاوند سے اس کا نفع اٹھانا زنا ہوگا۔ لیکن عائلی قوانین کی رو سے یہ سب کچھ جائز اور حلال ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس اس کے برعکس بھی کئی صورتیں نکلیں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ قرآن پاک کا کھلا مقابلہ ہے۔ جس کی عائلی قوانین کے مصنفین کے سوا کوئی مسلمان بھی جرأت نہیں کر سکتا۔

ایک دوسری دفعہ، نابالغہ کا نکاح عائلی قوانین میں جرم ہے نکاح کو ثابت نہیں سمجھا جائیگا۔ جبکہ قرآن کریم کی صریح نص دلالۃ النص سے یعنی میں بتلایا گیا ہے کہ جس عورت کو ابھی تک ماہواری نہیں

آئی اسکی عدت تین ماہ ہے۔ ظاہر ہے کہ عدت طلاق کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور طلاق فرع ہے نکاح کی اب اگر صغیرہ کا نکاح ہی نہیں ہوتا تو اس پر طلاق کیسی ۔؟ اور جب اس پر طلاق واقع نہیں ہوئی تو اسکی عدت کیسی ۔۔۔

علاوہ ازیں صحاح ستہ میں حدیث پاک کی پانچ معتبر کتابوں نے صدیقہ عائشہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صغر سنی میں نکاح کی تصریح موجود ہے۔ اگر حدیث کی ان معتمد ترین کتابوں میں سے پانچ کتابوں کی روایت غیر معتبر ہو جاتی ہے تو پھر کتب اسلام کی وقعت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ اور اس طرح تو پھر سارا دین ہی ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

دراصل کم سن بچوں کے نکاح کے خلاف دشمنان اسلام نے اس لئے غوغا آرائی کرنے پر زور دیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح خود مسلمانوں کے ہی قلم اور زبان سے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کو معاذ اللہ بالواسطہ سہی نامناسب اور ناجائز کہلوایا جائے۔ اور افسوس صد افسوس کہ عیار دشمن اس میں کامیاب ہو گیا۔ مسلمان نے اس طرح کے نکاح کو قابل جرم کہا اور یہ نہ سوچا کہ اس کی زد کہاں جا پڑتی ہے ۔۔۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

۳۔ ایک اور دفعہ : قرآن و سنت نے نکاح منعقد ہونے کے لئے دو مسلمان گواہوں کے سامنے زوجین کے ایجاب و قبول کو کافی ٹھہرایا ہے۔ جس پر امت کے ہر طبقہ کا اجماع موجود ہے۔ مگر عائلی قوانین نے اس میں ایک اور شرط بڑھا کر الزائد فی کتاب اللہ۔ پر وارد شدہ لعنت کا اپنے آپ کو مستحق ٹھہرایا ہے یعنی یہ کہ جب تک اس کا رجسٹریشن نہیں کیا جاوے گا۔ نکاح ثابت نہیں ہوگا۔ زوجین کے ایجاب و قبول پر دو عادل گواہ موجود ہیں۔ مگر نکاح کو اس لئے ثابت نہیں سمجھا جاتا کہ اس کا رجسٹریشن نہیں کیا گیا۔ زید کی عورت کو جس کا نکاح دو عادل گواہوں سے ثابت ہے عائلی قوانین نے عمرو کے ساتھ اس لئے نکاح کرنے کی اجازت دے دی ہے کہ وہ نکاح رجسٹرار کے ہاں درج نہیں ہے شریعت محمدیہ علی صاحب الصلوٰۃ والتحیہ کے حکم میں ایسی عورت کے ساتھ عمرو کا نکاح قطعاً حرام اور عمرو کی ایسی عورت کے ساتھ قربت یقینی زنا متصور ہوگی مگر عائلی قوانین نے اس حرام زنا کو حلال قرار دیدیا۔ ۔۔۔ اور طرفہ تماشا یہ کہ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جاوے گا، کا اعلان کرنے والے اس قانون کو تحفظ بھی دے رہے ہیں، فیاللعجب۔ اسی طرح تعدد ازدواج پوتے کی میراث وغیرہ دفعات کا حال ہے۔ غرض کہ یہ ایوب خان کیطرح نشۂ اقتدار میں کسی کو اس پر اصرار ہے کہ قرآن و سنت کے یہ قوانین منافی نہیں ہیں۔ اور قرآن و سنت کے یہ معنی نہیں ہیں جو علماء اسلام سمجھ رہے ہیں۔ اور ہم جو بے خبری از اسلام

کے باوجود چونکہ تعلیم یافتہ میں علماء اسلام کے مقابلہ میں قرآن و سنت کو زیادہ سمجھتے ہیں تو بھی اتنی بات تو واضح ہے کہ ملک میں رہنے والے اہل سنت والجماعت کے تمام طبقے دیوبندی بریلوی اہل حدیث نیز اہل تشیع ان قوانین کو اپنے اپنے مذہب کے خلاف سمجھ رہے ہیں۔ جیسا کہ حوالہ جات بالا سے ثابت ہو رہا ہے تو جسطرح ان قوانین سے ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسیوں کو ان کے مذہبی عائلی قوانین کے احترام میں مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ چاہے ان قوانین کے مصنفین کے نزدیک ان کے عورتوں پر ظلم بھی ہو رہا ہے تو اہل سنت کے تمام طبقات اور اہل تشیع کو بھی ان قوانین سے مستثنیٰ کر دیا جائے کیا ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ مذاہب کا احترام تو ضروری ہے۔ لیکن پاکستان میں کروڑوں اہل سنت اور اہل تشیع کے مذہب کا احترام ضروری نہیں ہے۔

آپ کہیں گے کہ اگر ان سب کو بھی مستثنیٰ کر دیا جائے تو پھر یہ قوانین چلائے کس پر جاویں گے تو اصولی جواب تو یہی ہے۔ کہ آخر شتر گفتن چہ ضرورت اگر پاکستان میں رہنے والا کوئی مذہب اس کو قبول نہیں کرتا تو جلا دیں ان کو آگ کی بھٹی میں دے ماریں۔ صدر ایوب کے منہ پر لیکن اگر یہاں کی ہر حکومت ان کو باقی رکھنے اور نافذ کرنے کی قسم ہی کھا بیٹھی ہے تو پھر جب تک پاکستان میں ارتداد کی کھلی چھٹی ہے ایک سول میرج ایکٹ قسم کا قانون رکھیئے کہ پاکستان کا جو باشندہ حنفی اہل حدیث دیوبندی بریلوی مودودیئے اور اہل تشیع ہونے سے بیزاری کا فارم بھرے گا۔ یہ قوانین اس پر چالو ہوں گے۔ اس طرح حکومت کی قسم بھی پوری ہو جائے گی۔ اور پابند مذہب لوگوں کا اشتعال بھی ختم ہو جاوے گا۔

■■

روحِ انتخاب

اسلام کا سوشلزم ـــــ اور ـــــ اسلامی تعلیم

"اقبال کا سوشلزم، حضرت ابوذرؓ کا سوشلزم یا اسلام کا سوشلزم اب اسلامی تعلیم کی راہ سے ہی آ سکتا ہے۔ اگر ہم وہ سوشلزم لانا چاہتے ہیں جو اقبال کے الفاظ میں "حرفِ قُلِ العفو" میں پوشیدہ ہے تو ہمیں ایک لمحہ کے لئے اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ جو شخص اپنا سارا فالتو مال خدا کی راہ میں دینے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ اور اپنے کل کی فکر نہیں کرتا، خدا کی رزاقیت اور ربوبیت پر اس کے ایمان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ خدا کے بالمقابل اُسے اپنی جان اور دنیا سے کتنی محبت ہوتی ہے۔ آخرت کی زندگی اور خدا کی بازپرس اُسے کس قسم کی حقیقت نظر آتی ہے۔ افلاس کے خوف سے اس کی آزادی اور بے پروائی کا رنگ کیا ہوتا ہے۔ خدا پر اس کے توکل کا مقام کیا ہوتا ہے۔ خدا کی اس گارنٹی پر کہ اس نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اس کا یقین کس قسم کا ہوتا ہے۔ کیا ہم میں سے ایک بھی ایسا ہے جو اس قسم کے ایمان اور توکل کا دعویٰ کر سکے۔ ! ایک طرف ہم بنکوں میں پڑے ہوئے ذہب اور فضہ کے بڑے بڑے ڈھیروں کی حفاظت جان سے بھی زیادہ کرتے ہیں۔ کہ ان میں ایک ذرّہ بھی ہل نہ جائے، اور دوسری طرف اسلامی سوشلزم اور حضرت ابوذرؓ کے سوشلزم کی تمنا کرتے ہیں۔ اور جب پوچھا جائے تو ہمارا جواب بالعموم یہ ہوتا ہے کہ جس وقت سب لوگ اپنے اپنے اندوختوں کو ترک کریں گے۔ ہم بھی اپنا اندوختہ ترک کر دیں گے۔ کیا حضرت ابوذر غفاریؓ کا جواب یہی ہو سکتا تھا جن کو اپنی موت کے وقت اس بات کا افسوس تھا کہ ان کے گھر میں لکڑی کا پیالہ کیوں موجود ہے۔ اور وہ اپنے خدا کے پاس ایسی حالت میں کیوں نہیں جا رہے کہ ان کے پاس کچھ بھی موجود نہ ہوتا۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ اقبال اور حضرت ابوذرؓ کا سوشلزم نافذ کرنے سے پہلے اسلامی تعلیم کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے دلوں میں خدا اور رسولؐ اور آخرت پر ابوذرؓ کا ایمان پیدا کر سکے۔"

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

(حکمتِ اقبال صفحہ ۳۰۰ - ۳۰۱)

(بشکریہ۔ اسلامی تعلیم۔ لاہور)

ایک نئی دنیا کی دریافت

از مولانا محمد علی جوہر مرحوم — ڈائری نولیس مولانا عبدالماجد دریابادی

آسٹریلیا یا افریقہ کے کسی وحشی کو جس نے اپنے وحشت زار سے زائد کچھ بھی نہ دیکھا ہو دفعۃً ایک پکڑ کر کسی جہاز پر تو سوار کرا دیجئے اور وہ جہاز رکے آکر ساحل امریکہ پر جو آج دنیائے قدیم کے ہر متمدن سے متمدن خطہ سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس وحشی کے لئے اس براعظم کا انکشاف کیا آج بھی ویسا ہی حیرت انگیز نہ ہوگا، جیسا کولمبس نے چار سو برس قبل کیا تھا؟ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس لئے کہ کولمبس کو تو خالی خولی ایک براعظم ہی ملا تھا۔ اور اس وحشی سیاح کو اس کے ساتھ ساتھ ایک پورا تمدن بھی ملے گا۔ اسکی مسرت اور اسکی حیرت کا کیا کہنا۔ بس یہی حال میرا بھی (قرآن پڑھ کر) مجھے بھی بیک وقت دوہری دولتیں نصیب ہوئیں۔ اللہ کو اور اللہ کے کلام کو تو سمجھا ہی۔ ساتھ ساتھ اپنی حقیقت بھی سمجھ میں آگئی۔ (ISLAM THE KINGDOM OF GOD ص۔ ۶۵)

لوگ کہتے ہیں کہ خود شناسی سے خدا شناسی تک پہنچو، یہاں الٹی خدا شناسی ہی خود شناسی کا بھی ذریعہ بن گئی۔ "من عرف نفسہ عرف ربہ" (جس نے اپنے کو پہچانا اپنے رب کو بھی پہچان لیا۔) مدت سے سنتے چلے آئے تھے۔ آج محمد علی کی زبان سے "من عرف ربہ عرف نفسہ" (جس نے اپنے رب کو پہچانا، اپنے آپ کو بھی پہچان لیا۔) بھی سن لیا۔

نو مسلم کے جوش تبلیغ کا اندازہ اسی نو مسلم کی زبان سے کیجئے۔

"میں اپنی اس نئی دنیا کی دریافت کو کیا اپنے ہی تک سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا؟ نہیں، کہاں ممکن تھا؟ دوسرے معاملات میں میں کیسا ہی خود غرض سہی، اس حقیقت کبریٰ کا، اس حقیقت الحقائق کا انکشاف جس گھڑی میرے روبرو ہوا، میرا سارا وجود اس سے پُر ہو گیا، میں اسے چھپانا چاہتا بھی تو میرے سینے کے اندر اس کا چھپا رہنا کیونکر ممکن تھا؟ میری روح کا تو رگ و ریشہ اس انکشاف سے پھٹنے لگا، اور جی بے اختیار بیقرار ہو ہو کر یہ چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر اور پکار پکار کر سب کو اس کی دعوت دینی شروع کر دوں ——— گھر کے بڑھوں بچوں کو، نوکروں، چاکروں، کتے، بلی، جانوروں کو، بیجان درختوں اور جھاڑیوں کو، سب کو یہی پیغام، یہی بشارت (دیوانہ وار) پہنچانا شروع کر دوں۔" (ص ۹۲)

قارئین

افکار و تاثرات

مولانا مدنی کے اندیشے | حضرت شیخ مدنیؒ کے اندیشے پڑھ لئے، بلکہ ستاد سے اور بہ تکرار۔ پروفیسر سلیم صاحب کا خط پڑھ کر میں نے بہت ضروری سمجھا تھا کہ پاکستان سے متعلق حضرت کی رائے بھی اس مضمون کا جزو ہونا چاہیئے۔ نہ صرف خیال بلکہ اس پر قلم بھی اٹھایا گیا "حضرت مدنیؒ پاکستان کے خلاف تھے؟" کے عنوان سے چند سطریں بھی لکھیں۔ خطبہ جو نہ مل گیا تھا۔ خطبہ سہارنپور اور کشف حقیقت کو کتب خانہ میں تلاش کر رہا تھا کہ تائید غیبی کے طور پر الحق مل گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمادے۔ بے حد خوشی ہوئی کہ جو کچھ سمجھانے میں میں وقت محسوس کرتا، قلم ساتھ نہ دیتا اور نقص تحریر کا گلہ باقی رہتا۔ وہ ساری کمی آپ نے پوری کر دی۔ لیکن جیسا کہ ترجمان الاسلام نے اُسے پمفلٹ کی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ (یعنی پروفیسر صاحب کے مضمون کو) ضروری ہے کہ یہ مضمون بھی اس کے ساتھ ہی قارئین تک پہنچے۔ نئی نسل پاکستانی پیداوار کو اس کا کوئی بھی علم نہیں کہ آخر حضرتؒ کا تصور ہی کیا تھا جس کی وجہ سے پروفیسر صاحب جیسے بزرگ بھی رو میں بہہ کر آپ کے خلاف گستاخانہ تحریر تک پہنچ گئے۔

مدیر ترجمان کو میں لکھوں گا کہ وہ اسے مضمون اعتراف تقصیر کا جزو بنائیں۔ البتہ ایک چیز اگرچہ آپ کی تحریر میں صاف کر دی گئی ہے کہ ان اندیشوں سے بچنے کا واحد علاج تقسیم ملک کے فوراً بعد بھی اور اب بھی یہی ہے کہ یہاں مکمل اسلامی نظام قائم کر دیا جاتا۔ اور اب بھی یہاں کامل اسلام کو نافذ کر دیا جاوے تو یہ خطرات سب ختم ہو سکتے ہیں اور جو پیش آگئے ہیں۔ ان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ بہرحال آپ کے مضمون میں یہ بات آگئی ہے۔ لیکن اس کو خاص طور پر نمایاں کرنا تھا، اور اب بھی ممکن ہو تو اسے مضمون کا ضمیمہ بنایا جاوے اور اگر آپ کا یہ مضمون اعتراف تقصیر کا جزو بن جاتا ہے تو اس میں بھی آجانا چاہیئے۔ تاکہ مولانا عبدالستار نیازی جیسے بزرگوں کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ "سقوط ڈھاکہ کے بعد آج ملک میں یہ نعرے بلند ہو رہے ہیں کہ ابوالکلامؒ اور حسین احمدؒ کا نظریہ صحیح تھا۔ اس قسم کا نعرہ لگانے والوں سے ہمیں ہوشیار رہنا پڑے گا ــــــــ یہ لوگ "اندیشے" قسم کے

مولانا قاری فیوض الرحمان ایم اے۔ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد

حضرت مولانا سید احمد صاحب

۱۸۸۰ء ——— ۱۹۵۰ء

پیدائش | آپ ۱۸۸۰ء میں تحصیل ایبٹ آباد کے ایک قصبہ "ربجھیہ" میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا میر احمد صاحبؒ ربجھیہ کی ایک مسجد محلہ "اسماعیل خیل" کے امام تھے۔

ابتدائی تعلیم | آپ کے والد نے اپنی بیماری میں آپ کو نصیحت کی کہ علم حاصل کرنے کے لئے چلے جاؤ۔ چنانچہ اپنے والد کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے آپ نے اس زمانہ کے رواج کے مطابق مختلف علماء سے علم دین حاصل کیا۔ آپ نے ہزارہ کے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی ان میں موضع "دلمسیڈہ" تحصیل ہری پور کے مولانا محمد معصومؒ بھی تھے۔ مولانا موصوف حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور کے بھی استاذ تھے۔ تذکرہ حسن میں انہوں نے مولانا محمد معصوم صاحبؒ کا ذکر کیا ہے۔
مولانا محمد معصوم صاحبؒ سے آپ نے منطق اور فلسفہ کی کچھ کتابیں پڑھی تھیں۔ اس کے بعد آپ ہندوستان چلے گئے۔ اور وہاں مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔

مدرسہ مطلع العلوم کا قیام | مولانا سید احمد اور مولانا خلیل احمد دونوں نے مل کر ایک مدرسہ "مطلع العلوم" قائم کیا۔ ریاست رامپور کے عربی مدارس میں مدرسہ عالیہ کے بعد اسی کا نمبر تھا۔ (اور اب بھی موجود ہے) مولانا خلیل احمد اس مدرسہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث تھے اور مولانا سید احمد اس مدرسہ کے نائب مہتمم اور صدر مدرس تھے۔ مولانا خلیل احمد کی وفات کے بعد آپ ہی اس مدرسہ کے مہتمم بھی رہے اور شیخ الحدیث بھی۔

آبائی وطن سے لگاؤ | آپ کو اپنے آبائی وطن "ربجھیہ" سے اتنا لگاؤ تھا کہ آپ ہمیشہ ماہ رمضان ربجھیہ میں آکر گذارتے تھے۔ اسی عرصۂ قیام کے دوران "باڈی سلطان خان" میں مولانا محمد علیم صاحب کے مدرسہ کے مہتمم ہونے کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ ایک دفعہ آپ حضرت مولانا خلیل الرحمٰن صاحب

مدظلہ العالی[1] کی دعوت پر مدرسہ رحمانیہ " ہری پور کے مہتمم بن کر بھی تشریف لائے تھے۔

جود و سخا | آپ کی طبیعت میں فیاضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب رجڑیہ آتے تو اپنے محلہ کے تمام غریب لوگوں کی امداد کرتے۔ مسجد میں کوئی مسافر آتا تو اس کے لئے خود اپنے گھر سے کھانا پکوا کر لاتے۔ آپ رحمدلی اور تقویٰ میں ایک بے نظیر انسان تھے۔

سب سے کم تنخواہ | مدرسہ مطلع العلوم کے مہتمم اور شیخ الحدیث ـــ کام سب سے زیادہ۔ لیکن تنخواہ سب سے کم لیتے تھے۔ بس گزارا الاؤنس ہی سمجھئے۔

مطلع العلوم سے لگاؤ | آپ تقسیم ملک سے کچھ پہلے رامپور سے رجڑیہ تشریف لے آئے تھے۔ آپ کو مدرسہ مطلع العلوم سے ایسا لگاؤ تھا کہ سنہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران بھی اپنے آپکو خطروں میں ڈال کر رجڑیہ سے ریاست رامپور جانے کا عزم کرلیا۔ اور بالآخر بمبئی ، بڑودہ ، ناگپور وغیرہ کے راستے رامپور پہنچے۔

واپسی اور انتقال | سنہ ۱۹۴۹ء میں آپ رامپور سے رجڑیہ تشریف لائے اور جون سنہ ۱۹۵۰ء میں اس دار فانی سے ہمیشہ کے لئے رحلت فرما گئے ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

اولاد | آپ کی دو صاحبزادیاں تھیں ، جن میں سے بڑی قاضی عبدالقادر مرحوم ایڈوکیٹ ایبٹ آباد کے نکاح میں تھیں دونوں میاں بیوی وفات پا چکے ہیں۔ ان کے چار بیٹے بقید حیات ہیں جو راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

دوسری صاحبزادی زندہ ہیں اور مولانا عبدالشکور صاحب ایم اے (گولڈ میڈلسٹ) فاضل دیوبند کی اہلیہ ہیں۔ ان سے چھوٹے امجد حسن ہیں۔ یہ مدرسہ عالیہ رامپور کے فارغ التحصیل بھی ہیں اور الہ آباد یونیورسٹی کے " فاضل ادب " بھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو فاضل کے امتحان میں بھی اول آئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں سنہ ۱۹۵۵ء تا سنہ ۱۹۵۹ء شعبۂ فارسی و عربی کے ناظم بھی رہ چکے ہیں ـــ سنہ ۱۹۶۰ء میں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے مصر گئے تھے۔ اب بھی وہیں ہیں اور قاہرہ یونیورسٹی میں اردو زبان کے لیکچرر ہیں۔

---

[1] آجکل مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مدرسہ احمد المدارس سکندر پور ، ہری پور میں شیخ الحدیث ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب (اکوڑہ خٹک) دامت برکاتہم کے دیوبند کے ساتھی ہیں۔ پرانے بزرگوں کی یادگار ہیں۔ نہایت ہی معمولی وظیفہ پر اس مدرسہ کی رونق کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔ اللہ قبول فرمائے۔ (ف)

جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارہ میں اپنے گستاخانہ رویہ پر اشکِ ندامت

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے سیاسی موقف سے اختلاف نہ پہلے گناہ تھا نہ اب ہے، بشرطیکہ یہ خلوص پر مبنی رہا ہو۔ مگر جہاں تک اپنے دور کے اس ولی کامل مجسمۂ اخلاص سراپا جہاد وعبدیت شیخ وقت کا تعلق ہے، ان کی شان میں توہین آمیز رویہ اور گستاخانہ جسارتوں کا ارتکاب ایک ایسا گناہ ہے جو علی رؤس الاشہاد اور ببانگ دہل اظہار ندامت اور توبہ و اعتراف تقصیر ہی سے شاید معاف ہو سکے۔ محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب صاحب دل اور صاحب قلم بزرگ ہیں، مسلم لیگ کے قافلہ سالاروں اور تحریک پاکستان کے اولین معماروں میں ہے مگر اللہ نے انکو خاص کرم سے نواز کر توفیق دی کہ وہ شیخ الاسلامؒ کی شان میں اپنے سابقہ گستاخانہ رویہ پر اشک ندامت بہائیں اور امت کے سامنے برملا اعتراف تقصیر کر سکیں، یہاں ان کے مضمون کے کچھ حصے پیش ہیں۔ (سمیع الحق)

اس تحریر سے دو مقاصد میرے پیش نظر ہیں۔ پہلا مقصد تو یہ ہے کہ گزشتہ زندگی (۱۹۳۶ء تا ۱۹۵۷ء) میں مجھ سے جس قدر گستاخیاں حضرت اقدس مجاہد اعظم شیخ الاسلام آیۃ من آیات اللہ الصمد سیدی و شیخی و سندی الحاج الحافظ المولوی سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ العزیز کی شان رفیع البیان میں سرزد ہوئی ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے غیر مشروط انداز میں اظہار ندامت اور اعتراف تقصیر اور اقرار جرم کروں اور بارگاہ ایزدی میں صدق دل سے استغفار کروں دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایک اہم تاریخی واقعہ کی وضاحت کر دوں اور حقائق کو ان کی اصلی شکل میں پیش کر دوں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے

بعض اخباری اطلاع کی بنا پر تین اشعار سپردِ قلم کئے تھے، جن کی وجہ سے علمی اور دینی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ جناب طالوت نے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول و منعطف کرائی کہ حضرتِ اقدسؒ نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ وطن کو اساسِ ملت بناؤ، اس لئے دیانت و عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ اب مجھے حضرت مولانا حسین احمدؒ صاحب پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کا یہ اعلان روزنامہ "احسان" لاہور میں ۲۰ر مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہو گیا تھا۔ لیکن قوم کی بدقسمتی سے ۲۱ر اپریل کو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا جبکہ ان کا آخری مجموعہ کلام مرحوم بہ ارمغانِ حجاز نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اگر یہ مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان تین اشعار کو حذف کر دیتے یا حاشیے میں اس حقیقتِ حال کو واضح کر دیتے کہ میں نے یہ اشعار غلط اخباری اطلاع کی بنا پر لکھے تھے۔ بعد ازاں حضرت مولاناؒ نے اخباری رپورٹ کی تردید کر دی، اس لئے ان اشعار کو کالعدم یا مستردہ سمجھنا چاہئے۔ لیکن افسوس کہ یہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا اس لئے نہ ان اشعار کو حذف کیا گیا اور نہ حاشیے میں حقیقتِ حال کو واضح کیا گیا۔

نتیجہ اس غفلت اور کوتاہی کا یہ نکلا کہ گزشتہ تیس سال سے مسلمانانِ عالم بالعموم اور مسلمانانِ پاکستان بالخصوص ان اشعار کی بنا پر حضرتِ اقدسؒ سے بدگمان ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کی اصلاحِ خیال کا ذریعہ بھی بن جاؤں تاکہ وہ سوءِ ظن کے گناہ سے محفوظ ہو جائیں۔ میں ان اشعار کو تو خارج نہیں کر سکتا مگر مسلمانوں کو یہ تو بتا سکتا ہوں کہ حضرتِ اقدسؒ نے اپنی تقریر میں نہ تو یہ فرمایا تھا کہ ملت کی بنیاد وطن ہے اور نہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ تم وطن کو اپنی ملت کی بنیاد بناؤ۔ یہ اشعار بلا تحقیقِ حال سپردِ قلم ہو گئے تھے چنانچہ جب ڈاکٹر صاحب پر حقیقت منکشف ہوئی تو انہوں نے اپنے الفاظ واپس لے لئے تھے بالفاظِ دیگر ان اشعار کو کالعدم کر دیا تھا۔

اب میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت اور استقامت طلب کرتا ہوں کہ وہ مجھے اظہارِ حق کی توفیق عطا فرمائے اور میری توبہ کو قبول فرمائے اور اس تحریر کو عامۃ المسلمین کے لئے نافع بنائے۔ آمین یا رب العالمین۔

یہ بات مسلمانوں کی قومی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کر سکتے، اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ میری یہ تنقید تلخ تو ہے مگر غلط نہیں ہے۔ جن لوگوں نے سلاطینِ وقت سے اختلاف کیا تو انہوں نے طاقت کے نشے میں مست ہو کر یا قتل کر دیا یا مجبوس

کر دیا اور جن افراد نے علماء سے اختلاف کیا انہوں نے اپنے مخالفین کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا۔ (آگے اسکی چند مثالیں درج کرنے کے بعد) دوسری صدی ہجری سے لیکر عصر حاضر تک کسی زمانے میں بھی اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا۔ یہ متعصبانہ روش اور یہ تنگ نظری صرف عقائد تک محدود رہتی تو بھی اک بات تھی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ یہ بیماری سیاست کی دنیا میں بھی داخل ہو گئی۔ جن لوگوں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کا پر آشوب دور دیکھا ہے۔ ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ حامیانِ مسلم لیگ ان تمام مسلمانوں کے اسلام کو شک اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو ان سے دلائل واضحہ اور براہین نیرہ کی بنا پر اختلاف کرتے تھے۔ نیز بلا استثنا ان تمام مسلمانوں کو غدار قوم، ضمیر فروش اور ہندوؤں کے زر خرید کہا کرتے تھے نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ (جب ہوش رخصت ہو جاتا ہے اور صرف جوش کار فرما ہوتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے) کہ مسلم لیگ کو کفر و اسلام کا معیار بنا لیا گیا تھا چنانچہ ہر شخص ببانگ دہل یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" حالانکہ کفر و اسلام کا معیار کسی سیاسی جماعت میں شرکت نہیں ہے۔ بلکہ اتباع شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے جس پر آج میری عقل بھی حیران ہے کہ مسلم لیگ تو وہ جماعت تھی جس میں داخلے کے لئے نہ مسلمانوں کی سی صورت شرط تھی نہ ان کی سی سیرت، نہ نماز روزے کی پابندی شرط تھی نہ دین سے واقفیت۔ اہل قرآن اور اہل حدیث، اہل فقہ اور اہل تصوف، بریلوی اور دیوبندی، سنی اور شیعہ، احمدی اور کمیونسٹ سب اس کے رکن بن سکتے تھے اور ۱۹۳۱ء میں اس کا صدر وہ شخص تھا جس کے ہم خیالوں کو اسلام سے خارج قرار دینے کے لئے ۱۹۵۳ء میں کراچی سے لاہور تک زبردست ہنگامہ بپا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو مسلمان مسلم لیگ میں شامل نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم دین کیوں نہ ہو۔ یہ تصور کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ ہندوؤں کا غلام ہے، ضمیر فروش ہے، غدار قوم ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے، خواص کے دماغوں پر بھی مسلط ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہی مولانا ظفر علی خان جنہوں نے حضرت اقدس مولانا مدنیؒ کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

گرمی ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے
جس سے ہے پرچم روایات سلف کا سر بلند

جب مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو ان کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہو گیا کہ انہوں نے اسی حسین احمد سے یوں خطاب کیا اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ میں کس عظیم المرتبت ہستی کو مخاطب بنا رہا ہوں ؎

حسین احمد سے کہتے ہیں مدینے کے خزف ریزے
کہ لٹو ہو گئے کیا آپ بھی سنگم کے موتی پر

اس شعر سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے شیخ الاسلام مجاہد اعظم حضرۃ

مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ العزیز کا علمی اخلاقی اور روحانی مقام خان مرحوم کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے لیگ سے اختلاف کیا تھا، خصوصاً ارکان جمعیۃ العلماء ہند، ان کی نیت نیک تھی، وہ ہرگز ضمیر فروش یا غدارِ قوم یا ہندوؤں کے زر خرید نہیں تھے، چنانچہ عزت مآب صدر مملکت پاکستان بالقابہ[1] نے بھی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "FRIENDS NOT MASTERS" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں: "سب لوگ جانتے ہیں کہ بہت سے علماء نے قائد اعظم سے علی الاعلان اختلاف کیا تھا اور پاکستان کے تصور کی تردید کی تھی، لیکن میرے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن علماء نے تشکیل پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ سب ضمیر فروش تھے۔ ان میں قابل اور مخلص لوگ بھی تھے۔ ہاں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی تشکیل سے ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا"[2]

فی الجملہ حقیقت یہی ہے کہ جمعیۃ العلماء کے ارکان نہ قوم کے بدخواہ تھے نہ ضمیر فروش بلکہ وہ —— علی وجہ البصیرت یہ سمجھتے تھے کہ نہ تو تقسیم ہند سے ہندی مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو سکے گا کیونکہ ان کی [illegible] آبادی ہندوستان میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔ اور وہ انہیں اپنے انتقام کا نشانہ بنائیں گے اور نہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو سکے گی، کیونکہ لیگ کے ارباب حل و عقد کی غالب اکثریت نہ دین سے واقف ہے اور نہ اس کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ لیکن حامیان لیگ نے مخالفت کے جوش میں اسلامی تہذیب اور علماء دین کے احترام دونوں باتوں کو طاق پر رکھ دیا اور اختلاف کرنے والوں کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی روا رکھی بلکہ اس پر فخر کیا۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں درج کرتا ہوں:-

۱۔ جب وہ ٹرین جس میں لیگ کے مخالف مسلمان قائدین سفر کر رہے تھے، علی گڑھ پہنچی تو یونیورسٹی کے مسلمان طلباء نے ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی نازیبا اور خلاف تہذیب حرکات کیں جن کی وضاحت بذات خود خلاف تہذیب ہے اور اگر وضاحت بھی کی جائے تو کوئی شخص یقین نہیں کرے گا۔ کہ کوئی شریف آدمی ان حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

---

[1] مراد ہیں سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب، واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے کئی سال قبل کی ہے۔ [2] عزت مآب صاحب صدر بالقابہ کے اس خیال سے مجھے کلیۃً اتفاق نہیں ہے۔
(سلیم چشتی)

۷۔ جب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سید پور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو حامیانِ لیگ کا ایک انبوہِ کثیر پلیٹ فارم پر جمع ہو گیا۔ ان لوگوں نے حضرت اقدسؒ کو گالیاں دیں اور جب حضرت موصوف پلیٹ فارم پر اترے تو مخالفین نے حضرتؒ کو زمین پر گرانے کی کوشش کی اور گریبان پھاڑ دیا اور ایک شخص نے عمامہ سر سے اتار لیا اور پھر اسے پاؤں سے روندا پھر نذرِ آتش کر دیا۔ (حیات شیخ الاسلام صـ۲۳۲ تا صـ۲۳۴)

میں نے دل پر جبر کر کے صرف دو واقعات درج کر دیئے ہیں۔ تفصیل سے عمداً اجتناب کیا ہے۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ اس زمانہ میں حامیانِ لیگ کی ذہنیت ایسی ہو گئی تھی کہ جو شخص ان سے سیاسی اعتبار سے اختلاف کرتا تھا اس کے ساتھ ہر بدسلوکی اور بے ادبی روا رکھی جاتی تھی بلکہ اُسے کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔

آج جب بیس سال کے بعد ایک طرف ہمارے جوش اور ہیجان میں سکون کا رنگ پیدا ہو گیا ہے اور دوسری طرف زندگی کے تلخ تر حقائق نے ہماری آنکھیں بھی کھول دی ہیں تو ہم پرانے مسلم لیگی، ان لوگوں کو رواداری کا اپدیش دے رہے ہیں جو اپنے سیاسی مخالفوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے نامور صحافی میم شین نے (جسے میں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں) اپنے ایک مضمون میں جو نوائے وقت مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا، مسلمانانِ پاکستان کو یہ مشورہ دیا تھا:

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم صیہونیت کے پروپیگنڈے کے زیرِ اثر انہیں (جمال عبدالناصر صدر جمہوریہ مصر) فرعون کی نسل کا علمبردار اور بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا نقاد بنا کر اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں، صدر ناصر عقائد کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمان ہی رہنے دینا چاہئے"

سبحان اللہ! آج اس درسِ اخوت کی صداقت میں کس پاکستانی کو شک ہو سکتا ہے۔ لیکن میں بڑے بھائی کی حیثیت سے، اپنے پیارے میم شین سے پوچھتا ہوں کہ جب قوم پرور مسلمان (کانگرسی، جمعیتی اور احراری) زعمائے مسلم لیگ کی خدمت میں یہی حقیقت ثابتہ (یہی درسِ اخوت وانسانیت) بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے کہ:

"یہ سچ ہے کہ جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کے ارکان تقسیم ہند کے حامی نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اس کو اپنی فراست مومنانہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے بہت مضر سمجھتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم لیگ کے پروپگنڈا کے زیر اثر انہیں ہندوؤں کا حاشیہ بردار اور کفر کا علمبردار اور مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کا حامی بنا کر اپنے (مسلمان) لوگوں کے سامنے پیش کرتا جاری رکھیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور ان کے ہم خیال حضرات عقیدے کے اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمانوں کو مسلمان ہی رہنے دینا چاہیئے: تو کون سا مسلم لیگی ان کی اس معقول بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوتا تھا۔؟ یا ہو سکتا تھا۔؟ اس زمانے میں تو سیاسی اعتبار سے اختلاف کرنے والے مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کا یہ عالم تھا کہ جب الجمعیۃ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر طلبہ کی گستاخی اور بد تہذیبی پر صدائے احتجاج بلند کی تو ڈان نے بڑے فخر کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ گلدستوں کے بجائے ان لوگوں کے حصے میں اینٹ پتھر ہی آئیں گے:

میرا مطلب اس تلخ نوائی سے صرف اس قدر ہے کہ اس زمانے میں ذہنیت ہی اس قسم کی ہو گئی تھی کہ ہم نے حفظ مراتب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور یہ راقم سیہ کار بھی اسی کشتی میں سوار اور اسی غلطی کا شکار تھا یعنی میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو علماء لیگ میں نہیں تھے۔ ان کی عظمت، وقعت، عزت اور منزلت میرے دل سے بالکل نکل گئی تھی۔ حالانکہ اب بیس سال کے بعد جب اس حماقت پر غور کرتا ہوں تو عرقِ ندامت میں غرق ہو ہو جاتا ہوں۔

جیسا کہ پہلے واضح کر چکا ہوں میں حضرت اقدسؒ کی طرف سے بدگمان تھا یعنی نفسِ امارہ کے پھندے میں گرفتار تھا۔ اسی لئے میں نے حضرت اقدسؒ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا۔ لہٰذا اب جبکہ حضرت اقدسؒ کی جلالت شان، للہیت، بزرگی اور بارگاہ رسالت میں ان کی قدر و منزلت مجھ پر آشکار ہو چکی ہے۔ اس لئے بصمیم قلب، انتہائی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی خطا اور گستاخی کی معافی طلب کرتا ہوں، استغفار کرتا ہوں، توبہ کرتا ہوں، اظہار ندامت کرتا ہوں اور اس اعتراف گناہ کو اس نیت سے شائع کرتا ہوں کہ قارئین میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری توبہ کو قبول فرمائے اور میرے گناہوں کو معاف کر دے اور قیامت کے دن مجھ سے اس گستاخی پر مواخذہ نہ کرے جو میں نے اس کے مقرب بارگاہ بندے کی جناب میں روا رکھی تھی ——

(نامکمل ہے)

★

ناظم دفتر اہتمام

احوال و کوائف

دارالعلوم

گورنر سرحد کی آمد مورخہ ۳۰ مارچ کو جناب حیات محمد خان صاحب شیرپاؤ گورنر صوبہ سرحد دارالعلوم تشریف لائے۔ دارالعلوم سے باہر اساتذہ و طلبہ نے ان کا استقبال کیا۔ دارالعلوم پہنچ کر آپ نے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کے ساتھ درسگاہوں، کتب خانہ اور نئی تعمیرات کا معائنہ کیا اور بے حد متاثر ہوئے، کچھ دیر کیلئے آپ مولانا سمیع الحق صاحب ایڈیٹر الحق کے ساتھ دفتر الحق میں تشریف لائے اور الحق سے اپنی دیرینہ دلچسپی اور تعلق کا اظہار فرمایا۔ بعد میں آپ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ کے ساتھ دارالحدیث ہال تشریف لے گئے اور طلبہ کے ساتھ حلقہ درس میں چٹائیوں پر بیٹھ گئے۔ اس استقبالیہ مجلس میں مولانا سمیع الحق صاحب نے طلبہ، اساتذہ دارالعلوم کی طرف سے آپ کی اچانک آمد کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ حکام اور امراء کا ان بوریہ نشین طلبہ علوم نبوۃ کے پاس آنا خود ان کے حق میں عزت اور بھلائی کی بات ہے۔ جبکہ علماء اور فقراء کا حکام کے در پہ جانا علم اور دین کی تذلیل ہے۔ اس طرح آج جناب شیرپاؤ صاحب کی اچانک آمد اور طلبہ کی محفل میں بیٹھنے سے علم پرور حکام کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ جناب محترم گورنر صاحب نے مختصر خطاب میں فرمایا کہ میں حضرت مولانا مدظلہ کا دیرینہ معتقد ہوں۔ اور میں نے حضرت مولانا اور دارالعلوم کے بارہ میں جو کچھ سنا تھا آج دارالعلوم کو اپنی توقعات سے بہت بڑھ کر پایا۔ علوم دینیہ کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمارا فرض ہے کہ پاکستان جس مقصد سے قائم ہوا ہے، اسے حاصل کرنے کے لئے ہم یہاں دین کے فروغ اور دینی تعلیم کی ترویج پر بھی پوری توجہ دیں۔ اس طرح اگر حکام ایک طرف کالجوں، یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں تو دوسری طرف یہاں اگر طلبہ علوم دینیہ سے بھی ملنا چاہیئے کیونکہ یہ لوگ قیام پاکستان کے اساسی مقصد کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں جو کہ اسلام کی اشاعت و حفاظت ہے۔ بعد میں جناب گورنر صاحب موصوف نے دفتر اہتمام میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ

کے ساتھ چائے نوش فرمائی، اس موقع پر گورنر صاحب موصوف نے اپنی جیب سے دارالعلوم کو پانچسو روپیہ کا گرانقدر عطیہ دیا۔

قائد جمعیت کی تشریف آوری | قائد جمعیۃ العلماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ حسب معمول پچھلے ماہ بھی متعدد بار پشاور آتے جاتے دارالعلوم حقانیہ میں رونق افروز ہوئے طلبہ اساتذہ بالخصوص حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے حالات حاضرہ پر پُر لطف مجالس رہیں۔ ۹ر مارچ کو سہ جماعتی معاہدہ کی بخیر و خوبی تکمیل کے بعد راولپنڈی سے دارالعلوم تشریف لائے اور رات کو جامع مسجد میں ایک عظیم الشان اجلاس سے خطاب فرمایا۔

ضروری تصحیح | پچھلے ماہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے مضمون مطالعاتی زندگی میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری قدس سرہٗ کے اسم گرامی کی جگہ سہو قلم سے محمد علی لکھا گیا ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔　　(ادارہ)

بقیہ افکار و تاثرات | مضامین سے لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ گویا یہ لوگ اب بھی اکھنڈ بھارت اور متحدہ ہندوستان بنانا چاہتے ہیں، اور دونوں ملکوں کو ایک ملک بنانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اور نہ کسی مسلمان کے ذہن میں یہ بات ہے۔ اب تو اس کا علاج صرف اور صرف اپنا استحکام، استقلال اور اسلامی احکام کا مکمل نفاذ ہے۔ اسی میں ہندوستانی مسلمانوں کی حفاظت ہے۔ اسی میں اپنا وقار اور اسی سے مستقبل قریب میں پورے ہندوستان کو مسلم بنایا جا سکتا ہے۔ پاکستانی مذاکرات کی تاریخ میں غالباً یہ سہ فریقی مذاکرات میں پہلی دفعہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ اگر جمہوری آئین کے مرحلہ پر بھی یہ چشم بد سے دور رہ جاتے ہیں، تو سرحد کی حد تک تو تاریخ کا یہ نیا باب ہوگا، مامورات شرعیہ کا اجراء اور منہیات الٰہیہ پر قدغن کیا خیال ہے سید شہید کی روح فرط مسرت سے جھوم نہیں اٹھے گی کہ ھذا تاویل رؤیای من قبل قد جعلہا ربی حقاً۔　　والسلام

(مولانا عبدالکریم ۔ کلاچی ۔ ۲۷ر محرم ۱۳۹۲ھ)

> مختلف مدارس میں جہاں پڑھائی کی طرف طلباء کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ وہاں یہ انتہائی ضروری ہے کہ لکھائی کی طرف بھی اسی اہمیت کے ساتھ زور دیا جائے۔ اور استاد صاحبان طلباء کو خوش خطی کے ساتھ ساتھ مختلف حروف اور الفاظ مثلاً ۃ اور ت، ح اور ہ، ڑ اور ر کے صحیح استعمال کے متعلق مفصل بتائیں تاکہ جب وہ حصول تعلیم سے فارغ ہو کر مضمون نگاری کے میدان میں آئیں تو ان کی تحریر معمولی غلطیوں کی وجہ سے بے جان نہ ہو

شیخ المحدثین نصیر الدین الغورغشتوی رح

كتبه الاحقر سميع الحق خادم العلم بدار العلوم الحقانيه و مدير مجلة ـ الحق ـ اكوڑه خٹك

★

شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین قدس سرہ کی سوانح کے بارہ میں یہ مختصر مضمون موصوف کے حاشیہ مشکوٰۃ شریف کی طبع ثانی کے لئے ناشر کتاب کی خواہش پر بطور دیباچہ لکھا گیا ہے حضرت مرحوم کے تلامذہ اہل علم کا زیادہ تر تعلق افغان علاقوں سے ہے جن میں اکثر اردو زبان نہیں سمجھتے، ان کی دلچسپی کیلئے اسے الحق میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

★

اسرته ومولده | هو الشيخ الاجل الزاهد المجاهد والمرشد الراشد نابغة العصر الثقة الثبت الفقيه بقية السلف آية من آيات الله شيخ الحديث مولانا نصير الدين بن مولانا جهاد الدين ابن مولانا سعد الدين ابن الشيخ محمد رسول بن اخوند محمد بشارت آباءهم (من قبيلة كاكڑ الافاغنة) رحلوا من قندهار بنية الجهاد ضد الهنود ثم اقاموا في بلاد "چھچھ" وكان والد الشيخ عالماً نحريراً ورعاً شيخ طريقة الچشتية في زمانه توفي غرة جمادي الاولى ۱۳۳۰ھ وكان سن الشيخ المحشي حينئذ اربع عشر سنة فيظهر من ذلك ان الشيخ ولد في ۱۲۹۵ھ ومولده غورغشتي مديرية "كيمبلپور" الواقعة في مقاطعة پنجاب ـ پاکستان ـ ودامت ارض چھچھ مرشحة بازهار العلم والورع ولازالت متلألاة بجواهر ثمينة كامثال الشيخ قطب الدين الغورغشتي والشيخ الاجل عبد الرحمان الهمبروي رح ومولانا سعد الدين الحلالوي رح وغيرهم من اعلام العلم والفضل۔

دراسته | تاثر الشيخ في اوّل حياته من والده غاية التأثر نشأ في اسرة تحلّت بخصائص العلم والتقوىٰ وبحسن تربية الاسرة والوالد الحنون نشأ في العلم والعبادة واجهاد النفس وسهر الليالي وتحلّى بمكارم الاخلاق زاهداً عن المظاهر

والتزامه به دراسته الابتدائية من اخيه الفاضل الشيخ شهاب الدين (وهو
والد الشيخ الكبير قطب الدين من ارشد تلامذة فقيه العصر سيدنا رشيد احمد الگنگوهیؒ)
ثم قرأ مبادئ النحو والصرف في بلدة "سرویه" مديرية "فتح جهنگ" واستكملها في
قرية "بلہ" من نواحي ملتان ثم رحل الى قرية "نوتهه" وتلمذ من الشيخ غلام رسول
المعروف به "انهی بابا" في كتب المنطق والمعاني ثم انتقل الى "چکوالہ" من منطقة
ميانوالی وقرء الصحاح الستة من الشيخ الاجل قاضي قمر الدين المحدث الشهير وصاحب
المدارج والمقامات (تلميذ الشيخ احمد حسن الامروهي من اجل تلامذة حجة الاسلام
محمد قاسم النانوتويؒ) والشيخ القاضي استرشد في السلوك عن الشيخ خواجه محمد عثمان
الداماني صاحب الطريقة المجددية بموسى زئی واستجاز في الصحاح عن الشيخ الاجل
احمد علی السهارنفوري۔

تدريسه: بعد فراغه من الدراسة وقف حياته لخدمة العلم وتدريس العلوم
والفنون وبلغ اوج الكمال في العلوم الآلية ولكن الله اصطفاه لحديث نبيه الكريم،
فذلك فضله يؤتيه من يشاء وبعد برهة من الزمان سافر الى رنگون عاصمة
برما يدرس اعواماً متفرقة ويطالع في مدرسة بجوار المسجد الجامع وفي هذا السفر
سافر من "رنگون" الى الحج والزيارة في عهد الحرب العالمية الاولى وخلافة السلطان
عبد الحميدؒ وفي ذلك الوقت شاعت مظالم الروس وهاجر المسلمون الى الحرمين
فاذا رأى الشيخ احوالهم المشعثة يتأثر شديداً ويبكي على مصائب المسلمين وفي عودته
من رنگون نزل في ديوبند۔ لما كان يسمع من محاسنه كثيراً و يزداد قلبه شوقاً الى ان
يلتحق بمعهد الاسلام و يتشرف بتلمذ شيخ العالم محمود الحسن الديوبنديؒ فحضر
في خدمته لاختبار الالتحاق بالمدرسة في الترمذي وهداية اخيرين وتوضيح تلويح
فاعترف الشيخؒ بذكاءه التام واستعداده الكامل ومكث اسابيع في ديوبند ولما وجد
الجو غير مساعد لصحته رجع الى بلدته غورغشتي وظل يدرس مشكوة المصابيح و
امهات الكتب من علم الحديث والتفسير والفقه وينشر السنن النبوية زهاء نصف
قرن الى وفاته حتى اختلط حب الحديث واختلاط به بلحمه ودمه وصار لقبه "شيخ الحديث"
علماً عليه اشهر من اسمه وجمعت اليه الطلبة من اقصى البلاد والاقطاع الاسلامية وصار

ومن بعد شيخ الاسلام له في الهند الآ بدار العلوم الديوبندية حيث يدرّس شيخ العرب والعجم مولانا حسين احمد المدني قدس سره العزيز ويحبّ التلامذة كالبحر افلاذ كبده وفي آلاف من تلامذته كبار العلم والمشيخة لم يكتفوا بتحصيل العلوم الظاهرية فقط بل استرشدوا منه في السلوك والارشاد واستكمال مدارج السلوك وكثير منهم فازوا بخلعة الخلافة في الطريقة النقشبندية والاجازة في علوم الحديث منهم مدرّسون وقضاة وحكام امتازوا بمزايا من اتباع السنة وانكار البدع مع حرمة السلف وهنه تشرفنا لما سألته تبركاً بالاجازة المسندة لسائر كتب الحديث فكتب في ورقة السند واني حصلت لي الاجازة والقراءة من شيخنا ومولانا القاضي قمر الدين الجكروالوي وحصل له الاجازة من مولانا وشيخ مشائخنا احمد علي السهارنفوري وحصل له الاجازة من مولانا شاه محمد اسحق الدهلوي — هذا يدل ان سنده اخصر واقصر الاسناد المتداولة في بلادنا۔

البيعة والاجازة | اجازة الشيخ حسين علي (وان بچهران) في طرق التصوف المجاز من خواجه محمد عثمان الداماني صاحب الفوائد العثمانية وكان الشيخ حسين علي من ابطال الاسلام في رد البدع ودعوة التوحيد التي غلبت على سائر احواله وكيفياته وصار الشيخ نصير الدين مرة عين لشيخه ومحبباً اليه صاحبه مدة طويلة ثم يتردد الى زيارته طيلة حياته وكان يقول مرشده "نصير الدين هدية اهدي بها الى ربي ان استقدني عز جلاله"۔

مزاياه وجهوده | كان مصداق قوله تعالى. لا يخافون في الله لومة لائم — ينقد دائماً على المنكرات مضطرياً لاعلاء كلمة الله وكبت اعداء الدين فحياته المباركة مصبوغة بصبغ الحسينية عليه سيما الجهاد دليلاً لاعلى جبينه كانه سيف مسلول في لاعماع الباطل ادخل السجن في حركة ختم النبوة. ضد القاديانية. مع ضعفه ومكث طويلاً في معتقل لاهور وساهيوال وغير ذالك مع رفقته من العلماء والمشائخ كان مشغلة في السجن الذكر والمراقبة والشيخ يقول اذا كان خارج السجن درس الحديث وفي السجن "الله الله. خير شغل وخير جليس" كذالك ينكر على الفرق الباطلة و دخاصة الحركة المودودية و يقول ان حاميها ضال ومضل ولا يجوز الصلوٰة خلفه من

ينتهي اليها. وليسعى دائماً لاجراء الاحكام والقوانين الشرعية في باكستان وتقوية جمعية
العلماء في تلك الاهداف ومع ضعفه ليسافر الى حفلات المدارس الدينية وارشاد الخلق

مزاياه ومن الله عليه | ومن منته تعالى عليه ان نشر الحديث بيديه في البلاد
الغربية الى ما وراء النهر بعد ان اندرست آثاره واضمحل صيته تحت الفلسفة
والمعقول فحوّل الله انظار العلماء في البلاد الافغانية الى الحديث بجهوده المباركة فلولا
عنايته بعلوم الحديث لقضى عليها بالزوال فالحق ان منزلته في بلاد وسط آسيا كمنزلة
الشيخ ولي الله الدهلوي الامام، محي السنة في الهند ومن مزاياه الاخلاص والخلوص الذي
هو روح العبادة فهذا الحل روح اعماله وجهوده ما اخذ اجراً قط على درس الحديث ولا
اراد الشهرة وما طلب المنصب ولا رضي برياسة اكبر المدارس ومشيخة المعاهد بل يدرس
في المسجد او في ظل الاشجار لا طلب ولا مَنّ تطوعاً محتسباً على الله فاغناه عن الاشتغال
بالتكسب والاجرة ورزقه التوكل والاعتماد على ذاته واعطاه الله القبولية والمحبوبية ما
يجعله لعباده المخلصين ومن من الله عليه ان اعطاه الله حظاً وافراً من الاعتدال
والحكمة في المسائل الخلافية فلا يبعد عن تغيير ولا تطير بمسلك السنة والجماعة ومن
مزاياه شدة تصلبه في الدين وانتصاره لفقه ابي حنيفة يؤيدها بالدلائل مع احترام
ائمة الفقه ومن مزاياه علو الهمة في العبادة واحياء الليالي بالتلاوة والصلوٰة والمطالعة
ومن مزاياه حسن منظره اذا رأيته تذكر الله وتقشعر قلبك من خشية الله يجذب اليه
كانه مغناطيس القلوب عليه سيما النور كانه ملك نزل من السماء خاشعاً متواضعاً في
تكلمه ومشيته وزاهداً في مسكنه ومطعمه.

حاشية على مشكوٰة | ومن مآثره المباركة هذه الحاشية ما تدل على تفقهه و
وتعمقه مع وجازته واختصاره يغني العالم والمتعلم من الشروح المتداولة فقد جمع
بين الرواية والدراية كانه سلالة المبسوطات فالحاشية مأثرة علمية مملوءة ببدائع
فرائده ودرر فوائده لاسيما هوامش الفصل الثالث من المشكوٰة لان احاديثه قلما توجد
في شروح الصحيحين واكثر الجوامع. وهذا مع انه لا يكتب بيديه بل يمليه على الكاتب
ثم يصحح واعتمد غالباً على شرح المشكوٰة لعلي القاري ولكن الاسف ان الحواشي ما
طبعت في ثوبه وشيق يليق بشانه مازال الشيخ يقوم باداء الخدمات العامة والذكر

والعبادة والدعوة والارشاد رغم شيخوخته وامراضه حتى استولت اشواق الحج والزيارة على مشاعره تشميًا الى زيارة بيت الله بالباخرة مع وخود شوقه الى الله ممن كان يد عوالمه بطول الحيات ينكر عليه ويتمنى موت الحرمين وان لا يرجع ولكن الله رحم جثته الطاهرة الضعيفة فتشرفه بلقاءه دون لقاء البيت ودعاه الى رحمته راضياً مرضياً بعد حياة حافلة بذالك يوم الخميس ۴ ذی القعدہ ۱۳۵۸ھ ۳ ۲۳ جنوری ۱۹۴۸ء بستان "واه" ثم انتقل جثمانه الى عنو عشتى وصلى عليه بعد صلوٰة الجمعة خامس ذى القعدہ الألف من العلماء والصلحاء والمسلمين بزفرات وعبرات على العلم والهدى فكان لجنازته منظراً لائقاً مالم يره العيون فى تلك البلاد ودفن فى الناحية الجنوبية من البلدة قربه ضريح الشيخ قطب الدين۔

وكان دعاءه كما قال الشيخ الامام محمد انور الكشميری فى رثاء شيخه شيخ الهند قدس سره ؎

سرى نعشه فوق الرقاب وطالما	سرى علمه فوق الركاب ودرفعا
وشيعه المخلوق من كل جانب	فلم ار الا المفضل كان مودعا
ولم ار مثل اليوم كم كان باكياً	وما كان و مع القوم وحاً مصيعاً

اللهم اعظم اجره ولا تفتنا بعده ؎

فقد بذل المجهود منه حياته	لخدمة دين الله ت بكلكل